

احوالِ صحافت

سہیل انجم

احوالِ صحافت

سہیل انجم

نام کتاب	:	احوال صحافت
مصنف	:	سہیل انجم
سال اشاعت	:	2012
تعداد اشاعت	:	چار سو (400)
قیمت	:	-/200 روپے
ناشر	:	سہیل انجم، A 370/6 ذاکر نگر، نئی دہلی 110025
کمپوزنگ	:	کفیل احمد (رابطہ 9871464966)
مطبع	:	شوبی آفسیٹ پریس، کوچہ چیلان، دریا گنج، نئی دہلی۔2

ملنے کے پتے:

سہیل انجم، 370/6A ذاکر نگر، نئی دہلی 110025
M. 9818195929
email: sanjumdelhi@gmail.com
s_anjum11@yahoo.com

مکتبہ نوائے اسلام 1164 چاوڑی بازار، جامع مسجد دہلی۔110006

''یہ کتاب اردو اکادمی دہلی کے مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔
اس کے مشمولات سے اکادمی کا متفق ہونا ضروری نہیں۔''

انتساب

فضیلۃ الشیخ مولانا صلاح الدین مقبول احمد

کے نام

کہ جن کی ذات اس شعر کی ترجمان ہے:

نرم دمِ گفتگو ، گرم دمِ جستجو
رزم ہو یا بزم ہو، پاک دل و پاکباز

فہرست

پیش لفظ

سہیل انجم

ہندوستان میں گزشتہ چند برسوں میں میڈیا کے شعبے میں زبردست فروغ ہوا ہے۔ جس میں الیکٹرانک میڈیا کے ساتھ ساتھ پرنٹ میڈیا کا بھی خاطر خواہ حصہ ہے۔ جس طرح ملک میں ٹی وی چینلوں اور بالخصوص نیوز چینلوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اسی طرح پرنٹ میڈیا یا مطبوعہ صحافت بھی مائل بہ نمو ہے۔ ٹی وی چینلوں کی تعداد میں اضافہ کے باوجود تعلیم یافتہ طبقہ نے اخبار بینی بند نہیں کی ہے۔ البتہ اخباروں کو پہلے جتنا وقت دیا جاتا تھا اب اس میں کمی آئی ہے لیکن اخبار بینی کا سلسلہ رک گیا ہو ایسا بالکل نہیں ہے۔ اخبار بینی کے اوقات میں کمی کے پیش نظر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اخبارات کی تعداد میں بھی تخفیف ہوتی اور پرنٹ میڈیا کو زوال ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوا ہے۔ اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ گزشتہ سال یعنی 2011 میں اخبارات کی تعداد بڑھی ہے۔ ہندی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو اخبارات کی تعداد میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت ہندوستان میں تقریباً آٹھ سو ٹی وی چینل ہیں جن میں چار سو سے زائد نیوز چینل ہیں۔ اس کے باوجود پرنٹ میڈیا میں 8.23 فیصد کا اضافہ ہوا ہے جو کہ حیرت انگیز ہے۔ اس میدان میں اردو اخبارات بھی کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ رجسٹریشن آف نیوز پیپرس ان انڈیا (آر این آئی) کی سال 2010-11 کی رپورٹ کے مطابق اردو اخبارات تعداد کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر ہیں۔

رپورٹ کہتی ہے کہ ملک میں سب سے زیادہ ہندی کے اخبار شائع ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد 7910 ہے اور ان کی مجموعی سرکولیشن 15,54,94,770 ہے۔ دوسرے نمبر پر

انگریزی ہے۔اس کے روزنامہ اخباروں کی تعداد 1406 ہے اور ان کی مجموعی سرکولیشن 5,53,17,184 ہے۔اردو روزنامہ اخبار تیسرے نمبر پر ہیں، ان کی تعداد 938 ہے اور ان کی مجموعی سرکولیشن دو کروڑ سولہ لاکھ انتالیس ہزار دو سو تیس (2,16,39,230) ہے۔ چوتھے نمبر پر گجراتی (761)، پانچویں نمبر پر تیلگو (603)، چھٹے نمبر پر مراٹھی (521) ساتویں پر بنگالی (472)، آٹھویں پر اڑیہ (245)، نویں پر کنڑ (200) اور دسویں نمبر پر ملیالم (192) ہیں۔ ملک میں کل رجسٹرڈ اخبارات کی تعداد 82,237 ہے۔ آر این آئی نے 2010 اور 31 مارچ 2011 تک مجموعی طور پر 13,229 اخباروں کو منظوری دی۔ (یہ رپورٹ 31 مارچ 2011 تک کی ہے)۔ ہندی میں سب سے زیادہ 32,793 اخبار رجسٹرڈ کیے گئے۔ انگریزی دوسرے نمبر پر رہی۔ اس کے رجسٹرڈ اخباروں کی تعداد 11,478 رہی۔ اس وقفے میں پورے ملک میں تمام زبانوں کی مجموعی سرکولیشن 32,92,04,841 ہے۔ جبکہ اس سے ایک سال قبل یہ تعداد 30,88,16,563 رہی ہے۔ آر این آئی کی اس 55 ویں رپورٹ کے مطابق اتر پردیش میں سب سے زیادہ 13,671 اخبار شائع ہوتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر دہلی ہے جہاں شائع ہونے والے اخبارات کی تعداد 1,933 ہے اور تیسرے نمبر پر مدھیہ پردیش ہے جہاں 1234 اخبار شائع ہوتے ہیں۔ سرکولیشن کے اعتبار سے بھی اتر پردیش سب سے آگے ہے۔ اس ریاست میں اخباروں کی تعداد اشاعت 6 کروڑ 97 لاکھ ہے۔ دہلی میں 5 کروڑ 27 لاکھ کاپیاں یومیہ چھپتی ہیں تو مہاراشٹرا میں 2 کروڑ 90 لاکھ اخبار چھپتے ہیں۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے تیلگو اخبار ''ایناڈو'' کی سرکولیشن سب سے زیادہ 16,74,305 ہے۔ یہ سنگل ایڈیشن اخبار ہے۔ اس کے بعد چنئی سے شائع ہونے والا روزنامہ ''ہندو'' ہے جس کی سرکولیشن 14,82,658 ہے۔ کلکتہ سے شائع ہونے والا بنگالی روزنامہ ''آنند بازار پتریکا'' تیسرے نمبر پر ہے۔ مذکورہ سال میں اخباروں کی جانب سے سالانہ اسٹیٹمنٹ داخل کرنے میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ 15 جون 2011 تک 14508 اسٹیٹمنٹ داخل کیے گئے جبکہ اس سے پہلے کے سال میں 13134 اسٹیٹمنٹ داخل کیے گئے تھے۔ گویا اس میں 10.46 فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

اس رپورٹ سے اردو اخباروں کی تعداد اشاعت کے تعلق سے جو اعداد و شمار سامنے آئے ہیں وہ چونکا دینے والے ہیں۔ اردو زبان کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ وہ زوال پذیر ہے اور اردو اخبارات کے قارئین کم ہوتے جا رہے ہیں۔ لیکن جو صورت حال سامنے آئی ہے وہ پرکشش بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالیہ برسوں میں اردو اخباروں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے لیکن یہ بھی ایک ناقابل تردید سچائی ہے کہ اخباروں کی تعداد میں اضافہ کے باوجود قارئین کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ اخبارات کے ایڈیشن بڑھتے ہیں لیکن ان کی اشاعت کم ہوئی ہے۔ اس وقت کئی اردو اخبار ایسے ہیں جو ملٹی ایڈیشن ہیں۔ روزنامہ ''انقلاب'' اور ''راشٹریہ سہارا'' کم از کم ایک ایک درجن شہروں سے شائع ہو رہے ہیں۔ ''صحافت'' اور ''اودھ نامہ'' چار شہروں سے نکل رہے ہیں۔ ''ہمارا سماج'' اور ''اخبار مشرق'' دو دو شہروں سے۔ مزید دوسرے اخبارات ایسے ہیں جو زائد از ایک شہروں سے نکل رہے ہیں۔ اس روشنی میں دیکھا جائے تو حالیہ دور کو اردو صحافت کا زریں دور کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا واقعی ایسا ہے؟ اگر اردو زبان اور اس کی موجودہ تعلیمی صورت حال کے تناظر میں جواب تلاش کیا جائے تو مایوسی ہوتی ہے۔ اخبارات کی تعداد میں اضافہ کا یہ مطلب نہیں کہ اردو زبان ترقی پر ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ بیشتر اردو اخبارات مالکوں اور مدیروں کے ذاتی مفادات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں اور کچھ نہیں۔ صرف دارالحکومت دہلی کی بات کی جائے تو یہاں رجسٹرڈ اردو اخباروں کی تعداد ایک سو سے زائد ہے اور اشتہارات کے سرکاری ادارے ڈی اے وی پی سے رجسٹرڈ اخباروں کی تعداد پچاس سے زائد ہے لیکن مارکیٹ میں محض چار پانچ ہی ہیں۔ دوسرے شہروں میں بھی یہی حالت ہے۔ ابھی چند روز قبل سرکاری ادبی ماہنامہ ''آجکل'' کے سابق مدیر محبوب الرحمن فاروقی کا ایک مضمون ایک اخبار میں شائع ہوا ہے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ سرکاری اخبار ''روزگار سماچار'' جو کہ ہندی اور انگریزی میں لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتا ہے، اس کے اردو ایڈیشن کی اشاعت بہت کم ہے۔ اسی طرح سرکاری اردو رسالے ''آجکل''، ''یوجنا''، ''سینک سماچار''، ''نیا دور'' اور ''دہلی'' جیسے رسائل کی تعداد اشاعت بھی بے حد کم ہو گئی ہے۔ ان کی اشاعت بڑھانے کی طرف حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی۔ جہاں تک

پرائیویٹ اخبارات و رسائل کی بات ہے تو ان کی بھی حالت بہت اچھی نہیں ہے۔ متعدد پرائیویٹ ادبی رسائل شاعروں اور ادیبوں کے گوشے شائع کر کے اپنے لیے کچھ مزید سانسوں کا بندوبست کر لیتے ہیں۔ خلیجی ملکوں یا امریکہ اور یوروپی ملکوں میں رہائش پذیر اردو ادبا و شعرا بھی ایسے رسائل کے لیے ''آکسیجن'' کی فراہمی کرتے ہیں۔ کئی غیر ادبی جریدے ایسے ہیں جن کے مالکان اشتہاروں کے لیے تگ و دو کرتے ہیں اور جب کچھ اشتہارات مل جاتے ہیں تو وہ یکمشت کئی شمارے شائع کر دیتے ہیں۔ کچھ ایک ہی شمارے میں کئی شمارے یکجا کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کئی ہفت روزہ اخبار ایسے ہیں جو صرف خصوصی شمارہ ہی شائع کرتے ہیں۔ بعض روزنامہ اخبارات ایسے ہیں جو صرف اس روز رنگین شائع ہوتے ہیں جس روز انہیں رنگین اشتہار ملتے ہیں۔ اگر وہ بلیک اینڈ وہائٹ میں شائع کریں تو اشتہار کے پیسے کم ہو جاتے ہیں۔

تقریباً ایک دو دہائی قبل ایسا کہا جاتا تھا کہ اب اردو صحافیوں کی نئی کھیپ پیدا ہونا بند ہو گئی ہے۔ لیکن مذکورہ حوصلہ شکن صورت حال کے باوجود اردو صحافیوں کی نئی کھیپ پیدا ہو رہی ہے اور اردو صحافت کے کارواں کو آگے بڑھا رہی ہے۔ بارہ سال قبل جب ''روزنامہ راشٹریہ سہارا'' جاری ہوا تھا تو اس میں ایڈیٹوریل میں کام کرنے والے زیادہ تر نئے صحافی تھے۔ اسی طرح جب روزنامہ ''انقلاب'' دہلی سے شروع ہوا تو اس میں بھی ایڈیٹوریل میں بیشتر کم تجربہ کار یا پھر بالکل ہی نئے صحافیوں کی تقرری ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نئے اردو صحافی پیدا ہونا بند نہیں ہوئے ہیں۔ البتہ ایڈیٹروں پر کمپیوٹر آپریٹروں کو ترجیح دینے سے صحافت کی کوالٹی گر رہی ہے اور معیار متاثر ہو رہا ہے۔ اگر کمپیوٹر کا علم ضروری ہو گیا ہے تو اردو اخباروں کو چاہیے کہ وہ پرانے اور تجربہ کار صحافیوں کو کمپیوٹر کی تربیت دلوائیں اور اگر کمپیوٹر آپریٹروں کو سب ایڈیٹر یا رپورٹر کے طور پر اپائنٹ کرنا ہو تو ان کو ایڈیٹوریل میں کام کرنے کی ٹریننگ دیں۔ لیکن ان باتوں کا لحاظ نہیں کیا جاتا۔ گزشتہ چند برسوں میں بہت سے نئے اردو صحافی میدان صحافت میں آئے ہیں اور ان کی اکثریت مدارس کے فارغین کی ہے۔ جو کھیپ یونیورسٹیوں سے آتی ہے ان میں بھی بیشتر کا بیک گراؤنڈ دینی مدارس کا ہوتا ہے لیکن یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کی

جس سے ان کا ذہنی افق کشادہ ہو جاتا ہے اور وہ کامیاب صحافی کے طور پر ابھرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس کتاب میں ایک مضمون میں اردو صحافیوں کی تربیت کی اہمیت کی جانب اشارہ کیا گیا ہے اور اس سلسلے میں بہت سی ایسی باتیں بتائی گئی ہیں جو اردو صحافیوں کے لیے کارآمد ہو سکتی ہیں۔ صحافیوں اور بالخصوص اردو صحافیوں کو ایک اچھا صحافی بننے کے لیے کن باتوں پر توجہ دینی چاہیے اس جانب بھی اشارے کیے گئے ہیں۔ اردو صحافت کے بارے میں ہمیشہ یہ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک مشن کے طور پر شروع ہوئی تھی۔ اس کی صداقت پر کسی کو کوئی شبہ نہیں لیکن اب حالات بدل رہے ہیں اور مشن کے خمیر میں بزنس کی سوندھی مہک ڈالنے کی ضرورت ہے تبھی اردو صحافت کی بقا کے راستے وا ہوں گے۔ صحافت کو جذباتیت کی منڈی بنانے سے بھی گریز کرنا چاہیے۔ قارئین کے جذبات کو مشتعل کرنے اور زرد صحافت کو رائج کرنے کے بجائے ان کے اندر تعمیری سوچ پیدا کرنے والی پالیسی اپنانے کی ضرورت ہے۔ مسائل کو اٹھانے کی کوشش میں جذبات سے کھیلنے کی اجازت نہیں دی جانی چاہیے۔ صحافت کے اولین نقوش کے طور پر بعض ابتدائی اخباروں میں شائع ہونے والے مواد کی تلخیص پیش کی گئی ہے۔

اکثر یہ بات اٹھائی جاتی ہے کہ اردو زبان کا رشتہ روزی روٹی سے منقطع ہو گیا ہے لیکن یہ بات کلی طور پر درست نہیں ہے۔ آر این آئی کی مذکورہ رپورٹ سے یہ معلوم ہوا کہ اس وقت پورے ملک میں اردو کے 938 روزنامہ اخبار نکل رہے ہیں۔ ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ اور سہ ماہی رسائل و جرائد اس کے علاوہ ہیں۔ اگر روزناموں سے لے کر سہ ماہی اور ششماہی جرائد تک کا شمار کیا جائے تو ان کی تعداد ہزاروں میں ہوگی۔ ان میں کام کرنے والوں کی تعداد یقیناً لاکھوں میں پہنچے گی۔ اس لیے یہ کہنا کہ اردو زبان روزی روٹی سے کٹ گئی ہے پوری طرح صحیح نہیں ہے۔ صحافت ایک باوقار پیشے کے ساتھ ساتھ ایک خطرناک پیشہ بھی ہے۔ صحافیوں کو کتنے خطرات لاحق رہتے ہیں اور وہ کس طرح ان میں گھر کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اس کی تفصیلات بھی پیش کی گئی ہیں۔ آجکل اردو صحافت میں کارپوریٹ اداروں کی آمد تیز ہو گئی ہے جس پر کچھ لوگ شکوک و شبہات کا اظہار کرتے ہیں اور کچھ لوگ اسے مستحسن تصور

ـتے ہیں۔ ایک مضمون میں اس صورت حال کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ چند ایسے مرحوم صحافیوں کا ذکر جمیل بھی ہے جو اپنے زمانے میں صحافت کے ستون رہے ہیں اور جن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ صحافت سے متعلق بعض کتابوں کا، جو حالیہ دنوں میں شائع ہوئی ہیں، جائزہ لیا گیا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ صحافت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے اور ان کے ساتھ ہی موجودہ صحافت کا محاسبہ بھی کیا جائے۔ اس سلسلے میں پوری دیانتداری برتنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخری باب میں ہمعصر الیکٹرانک میڈیا کی ایک جھلک پیش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین کو اس کتاب کے مشمولات پسند آئیں گے۔ اگر ایسا ہوا تو راقم الحروف یہ سمجھے گا کہ اس کی محنت رائگاں نہیں گئی۔

باب اوّل:

اردو صحافت: تاریخ، تشکیل، تصویر

اردو صحافت اور اس کی مختصر تاریخ

اردو صحافت اپنا ایک نہایت تابناک اور درخشاں ماضی رکھتی ہے۔ اس نے جدوجہد آزادی کے باقاعدہ آغاز سے قبل اپنی آنکھیں کھولیں اور پھر اس نے جدوجہد آزادی میں ایسا کردار ادا کیا جو لازوال بن گیا۔ اردو صحافت ایک مشن کے طور پر شروع ہوئی تھی اور اس نے رفتہ رفتہ ترقی کی منازل طے کیں۔ آج کے مادہ پرست دور میں جبکہ ہر چیز کامرشلائزڈ اور تجارتی ہوگئی ہے، اردو صحافت کسی نہ کسی شکل میں آج بھی ایک مشن بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ بہت سے لوگوں کا کہنا ہے کہ اسے بھی تجارتی تقاضوں سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے تاکہ اس مادہ پرست دور میں اس کی بقا کی بھی کوئی صورت نکالی جا سکے۔

اردو صحافت کے بارے میں جاننے سے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ صحافت کسے کہتے ہیں اور اس کا آغاز کب ہوا۔ صحافت کسی بھی واقعہ کو نشر کرنا یا دوسروں تک پہنچانا ہے اور اس انداز میں پہنچانا ہے کہ سب لوگ سمجھ سکیں۔ صحافت دراصل عربی زبان کے لفظ ''صحف'' سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی صحیفہ، کتاب یا رسالہ کے ہیں۔ جبکہ انگریزی میں یہ جرنل (JOURNAL) سے ماخوذ ہے۔ اسی لیے صحافت کو انگریزی میں جرنلزم کہا جاتا ہے۔ ایک امریکی مصنف روینڈ اور دوسرے مصنفوں نے صحافت کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہا ہے کہ صحافت جدید وسائل ابلاغ کے ذریعہ عوامی معلومات، رائے عامہ اور عوامی تفریحات کی باضابطہ اور مستند اشاعت کا فریضہ ادا کرتی ہے۔

جبکہ لیزی اسٹیفن نے اپنی کتاب ''صحافت ایک تعارف'' میں لکھا ہے کہ صحافت ان معاملات کو ضبط تحریر میں لا کر استفادہ کرنے کا نام ہے جن کے بارے میں آپ کچھ نہیں

جاتے۔ بعض دوسرے ماہرین کے مطابق صحافت معلومات کو ایک جگہ سے دوسری جگہ دیانت، بصیرت اور صفائی سے ایک انداز میں پہنچانے کا نام ہے جس میں ترقی کی بات ہو۔ صحافت نے جوں جوں ترقی کی اس کے بارے میں عوامی خیالات اور رجحانات بھی سامنے آنے لگے۔ صحافت کے بارے میں بہت سے مصنفوں، قلم کاروں اور ادیبوں نے مقولے بھی گھڑے ہیں۔

مختصر تاریخ

متعدد کتابوں کے مصنف اور مرتب اور قابل قدر قلمکار محمد افتخار کھوکھر صحافت کی تاریخ پر اجمالی طور پر روشنی ڈالتے ہوئے کہتے ہیں "جدید خبر نویسی کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ 1566 میں وینس کے شہر میں یہ طریقہ تھا کہ ایک شخص عام شاہراہ پر بلند آواز میں لوگوں کو دنیا کی خبریں ایک قلمی مسودے سے پڑھ کر سناتا۔ یہ مسودہ حکومت کی نگرانی میں مرتب کیا جاتا تھا۔ جو لوگ ان خبروں کو سنتے تھے ان سے ایک گزٹ وصول کیا جاتا تھا جو رائج الوقت سکہ تھا اور اسی کی مناسبت سے گزٹ کا لفظ ایجاد ہوا جو خبر کے معنی میں بولا اور لکھا جاتا ہے۔ اس تجربے کے بعد یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی خبرناموں کا رواج شروع ہوا۔ پہلا مطبوعہ خبرنامہ 1609 میں جرمنی میں جاری کیا گیا۔ دو سال بعد اسی قسم کا ایک خبرنامہ 1611 میں شائع ہوا۔ پہلا باضابطہ اخبار انگریزی زبان میں 1620 میں شائع ہوا۔ اس کا نام ویکلی نیوز تھا۔ اس کے بعد 1631 میں فرانس سے گزٹ آف فرانس جاری ہوا۔ امریکہ کا پہلا اخبار "پبلک آکرینسز" تھا جو 1690ء میں بوسٹن سے جاری ہوا۔ برصغیر پاک و ہند میں سولہویں صدی کے وسط میں پرتگیزیوں نے چھاپہ خانہ قائم کیا۔ اس کے بعد انگریزوں نے 1672 میں بمبئی میں پہلا چھاپہ خانہ شروع کیا۔ ہندوستان میں سب سے پہلا مطبوعہ اخبار 29 جنوری 1780 کو انگریزی زبان میں آگسٹس ہکی نے "ہکیز بنگال گزٹ" کے نام سے کلکتہ سے جاری کیا۔ اس کے 26 سال بعد 1822 میں منشی سدا سکھ لعل اور ہری دت نے اردو کا پہلا اخبار "جام جہاں نما" کلکتہ سے ہی جاری کیا۔ اس طرح ہندوستان کی انگریزی، فارسی، بنگالی اور اردو صحافت کا آغاز انگریزوں کے پہلے دارالحکومت کلکتہ سے ہوا"۔

"جامِ جہاں نما" اردو کا پہلا اخبار تھا۔ اس کے بعد دوسرا اخبار "دہلی اردو اخبار" تھا جسے مولوی محمد حسین آزاد کے والد مولانا محمد باقر نے شروع کیا تھا۔ اس کا اجرا 1837 میں ہوا تھا۔ 13 مئی 1840 تک اس کا نام "دہلی اخبار" تھا پھر "دہلی اردو اخبار" ہو گیا۔ 1857 سے پہلے کے اخباروں میں یہ سب سے بے باک، بے خوف اور با اثر اخبار تھا۔ لیکن انگریزوں نے مولانا باقر کو شہید کر دیا اور اس طرح انھیں پہلا شہید صحافی کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے "سید الاخبار" نکالا۔ امداد صابری کے مطابق یہ ہفت روزہ تھا اور 1837 میں جاری ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر مولوی عبد الغفور تھے۔ یہ اخبار 1848 تک جاری رہا۔

اس زمانے میں دہلی سے شائع ہونے والا "صادق الاخبار" بھی نہایت جری اور بیباک تھا۔ "ابلاغیات" کے مصنف ڈاکٹر محمد شاہد حسین کے مطابق "اس نام کے کئی اخبار دہلی سے نکلے تھے۔ ان میں سے ایک یا دو صادق الاخبار کا ذکر 1857 کی جنگ آزادی کے سلسلے میں بھی بار بار آتا ہے۔ ان میں سے ایک اخبار کو بہادر شاہ ظفر کے مقدمے میں ثبوت کے طور پر بھی پیش کیا گیا تھا۔ مگر وہ کون سا صادق الاخبار ہے اس میں اختلاف ہے"۔ جبکہ افتخار کھوکھر کے مطابق ایک "صادق الاخبار" 1844 میں شیخ امداد حسین کے زیر ادارت جاری ہوا اور جنوری 1856 میں دوسرا صادق الاخبار شیخ خدا بخش نے شروع کیا تھا۔

اس کے بعد جو اردو اخبارات نکلے وہ اس طرح ہیں

کریم الاخبار، مولوی کریم الدین 1835 دہلی۔ اسعد الاخبار، قمر الدین 1847 آگرہ۔ اعظم الاخبار، نواب محمد غوث خاں اعظم 1849 مدراس۔ تیسیر الاخبار، حکیم عبد الحمید عشق 1849 مدراس۔ شملہ اخبار، مولوی عبداللہ 1847 شملہ۔

1857 کے بعد اردو اخبار بڑی تعداد میں جاری ہوئے تھے جن میں سے چند کے نام یوں ہیں

ہفت روزہ شمس الاخبار مدراس، روزنامہ طلسم حیرت مدراس، سہ روزہ قاسم الاخبار منگلور، ہفت روزہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، ہفت روزہ آگرہ اخبار، روزنامہ مفید عام

اخبار آگرہ، ہفت روزہ خیر خواہ عالم دہلی، ہفت روزہ نصرت الاخبار دہلی، سہ روزہ ریاض الاخبار گورکھپور، ہفت روزہ جریدہ روزگار مدراس، ہفت روزہ نیر اعظم مراد آباد، ہفت روزہ اودھ پنچ لکھنؤ، ہفت روزہ مہر نیم روز بجنور، ماہنامہ حافظ صحت لاہور، ہفت روزہ دہلی پنچ لاہور، ہفت روزہ آفتاب ہند جالندھر، ہفت روزہ تحفہ ہند میرٹھ، ہفت روزہ سراج الاخبار جہلم، ماہنامہ زمیندار گوجرانوالہ، ہفت روزہ پیسہ اخبار گوجرانوالہ، ہفت روزہ پیسہ اخبار لاہور، اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ، ہفت روزہ [illegible] اخبار لاہور، ہفت روزہ وکیل امرتسر، ہفت روزہ کرزن گزٹ دہلی، تہذیب الاخلاق علی گڑھ، ہفت روزہ اودھ پنچ لکھنؤ، ماہنامہ اردوئے معلی علی گڑھ، اخبار ہمدرد دہلی، ہفت روزہ زمیندار لاہور، ہفت روزہ الہلال کلکتہ، البلاغ کلکتہ، ہفت روزہ مدینہ بجنور۔

محمد [illegible] حسین لکھتے ہیں کہ ایک اندازے کے مطابق اردو صحافت کے آغاز سے 1917ء تک 1547 اردو اخبارات جاری ہوئے۔ تقسیم ملک کے بعد بہت سے اردو صحافی پاکستان چلے گئے اور چند پاکستان سے ہندوستان آگئے۔ پاکستان سے آکر ہندوستان میں مشہور ہونے والے اخبارات میں پرتاپ، ملاپ، ہند سماچار اور قومی آواز ہیں۔ آزادی کے بعد ملک کے مختلف شہروں سے کثیر تعداد میں اردو اخبارات جاری ہوئے جن میں سے کچھ انتہائی معیاری تجارت [illegible] سے [illegible] آندھرا پردیش، پنجاب کی [illegible] ہوتے ہیں۔

[illegible]

[illegible] عبدالماجد دریابادی (سچ اور صدق جدید لکھنؤ)، سر سید احمد خان (اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ [illegible])، [illegible] اردوئے معلی [illegible] ابوالکلام آزاد (الہلال [illegible])، [illegible] ظفر علی خان (زمیندار [illegible])، [illegible] زمیندار گوجرانوالہ [illegible] [illegible] ہفت روزہ ریاست دہلی، [illegible] محمد مسلم (دعوت دہلی)، شاہد احمد دہلوی (ساقی دہلی)، سید سلیمان ندوی (معارف اعظم گڑھ)، [illegible] انصاری غازی (مدینہ بجنور)، [illegible] خوشحال چند [illegible] بیج (ملاپ دہلی)، قاضی عبدالغفار (پیام حیدرآباد)، حیات اللہ انصاری

قومی آواز لکھنؤ، عشرت علی صدیقی قومی آواز دہلی، جمیل مہدی عزائم لکھنؤ، خواجہ احمد عباس بلٹز بمبئی، ظ۔ انصاری آئینہ دہلی اور عبدالحمید انصاری انقلاب بمبئی وغیرہ۔

مذہبی صحافت

اردو صحافت کا مزاج احتجاجی اور باغیانہ رہا ہے۔ اس لیے جہاں ایک طرف ملک کو آزادی دلانے کے میدان میں اردو اخبارات پیش پیش رہے، وہیں اردو صحافت نے مذہبی صحافت کی طرف بھی رخ کیا اور اردو اخباروں نے عیسائی مشنریوں کے خلاف بگل بجا دیا۔ "اردو صحافت انیسویں صدی میں" کے مصنف ڈاکٹر طاہر مسعود لکھتے ہیں "آٹھویں صدی عیسوی میں محمد بن قاسم نے جب سندھ کو فتح کیا تو اسلام اس خطے کے قدیم مذاہب کے درمیان ایک جدید اور روشن خیال مذہب کی حیثیت سے پھیلا۔ پندرہویں صدی کی آخری دہائی میں واسکوڈی گاما نے ہندوستان تک پہنچنے کا سمندری راستہ تلاش کر لیا۔ یہ واقعہ اس سرزمین پر عیسائیت کی تبلیغ کا باعث بنا۔ انیسویں صدی میں تینوں مذاہب یعنی ہندومت، اسلام اور عیسائیت ایک دوسرے کے اعلانیہ حریف بن کر سامنے آئے۔ چنانچہ یہ صدی ان مذاہب کی باہمی کشمکش اور تصادم سے عبارت ہے اور اس صدی کی مذہبی صحافت اسی مبارزت آرائی کا منطقی نتیجہ ہے۔ اردو صحافت میں مذہبی اخبارات کے آنے کے رجحان نے مقدمے کو رواج بخشا۔"

عقیدے کی جنگ دوسرے مذاہب سے بھی ہوتی رہی ہے اور اندرون مذاہب بھی ہوتی رہی ہے۔ طاہر مسعود کے مطابق ہندوستان میں مذہبی صحافت کی بنیاد عیسائی مشنریوں نے رکھی۔ راجہ رام موہن رائے پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے عیسائی مشنریوں سے پیدا شدہ خطرے کا جواب دینے کے لیے 182 میں ایک رسالہ "برہمنیکل میگزین" کا اجرا کیا۔ بعد میں ہندو ... نے ... کیا۔ اسی طرح شمالی ہند میں اردو صحافت کا آغاز ہوتے ہی دو پادریوں نے "خیر خواہ ہند" کے نام سے مرزاپور اور بنارس سے دو رسالے جاری کیے۔ جبکہ دہلی کے مسلمانوں میں مسلکی اختلافات پیدا ہوئے اور انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف اخبارات کا اجرا کیا۔ شمالی ہند میں عیسائی مشنریوں کے ردعمل میں پہلا اخبار 1845 میں بنارس گزٹ کے نام سے کاشی سے ... ایک ہندو

گوبند رگھوناتھ تھے۔ تاہم طاہر مسعود کے مطابق "جنگ آزادی سے قبل تک اردو صحافت میں مذہبی اخبارات کا کوئی باقاعدہ رجحان نظر نہیں آتا۔ ایسے اخبارات کے اجرا کا رجحان صحیح معنوں میں 1857 کی جنگ آزادی کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔ اس دور میں عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیاں ملک بھر میں پھیل چکی تھیں۔ مذہبی مناظرہ بازی بھی عام ہو گئی تھی، جس میں پادریوں کے مقابلے میں مسلم علما اور ہندو مذہبی پیشوا اپنے اپنے مذاہب کے دفاع میں مناظرے کرتے جن کی روداد اخباروں میں تفصیل سے شائع ہوتی تھیں"۔

عقائد کے اس تصادم نے مذہبی اخبارات کے اجرا کی راہ ہموار کی۔ مشنریوں نے مناظرے کیے تو ہندو اور مسلم علما بھی خم ٹھونک کر مناظرے کے میدان میں اتر پڑے۔ پھر بھی طاہر مسعود کہتے ہیں کہ مذہبی اخبارات کے اجرا کو محض مشنریوں کی تبلیغ کا ردعمل سمجھنا پوری طرح درست نہ ہوگا۔ اہل اسلام اور ہندو مذہب میں مختلف مسالک کے ماننے والوں نے بھی اپنے مسلک کی حفاظت اور ترویج و اشاعت کے لیے اخبارات نکالے تھے۔ بہر حال 1821 سے 1898 تک عیسائیوں، مسلمانوں اور ہندوؤں نے جو مذہبی اخبارات نکالے ان کی کل تعداد تقریباً 40 ہے۔ عیسائی رسائل و جرائد کی تعداد نو، مسلم مذہبی رسائل کی تعداد دس، ہندو مذہبی رسائل کی تعداد نو اور آریہ سماجیوں کے مذہبی رسائل کی تعداد 12 ہے۔ اس دور میں سکھوں اور قادیانیوں کے بھی متعدد مذہبی اخبارات نکلتے رہے۔

اردو صحافت کی خصوصیات

اردو صحافت نے اپنی پیدائش سے لے کر اب تک کافی ترقی کی ہے اور یہ اب بھی ترقی کی شاہراہ پر نئی شکل میں گامزن ہے۔ اردو صحافت کی ترقی کا ایک راز خود اردو زبان ہے۔ اردو زبان کا جادو ہے، اس کی شیرینی ہے، اس کی لطافت ہے، اس کی اثر انگیزی ہے، اس کی عوامی رسائی ہے۔ اسی طرح اس زبان کی بہت سی خصوصیات ہیں جن کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ اردو زبان کی شیرینی اور مٹھاس نے ہی غیر اردو داں طبقہ کو اپنے الفاظ استعمال کرنے کی جانب متوجہ کیا اور آج ہندی کے قومی اخبارات اور ٹی وی چینل بڑی تعداد میں اردو کے الفاظ استعمال کرتے

ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس زبان میں ترسیل آسان ہے اور عوام کو یہ زبان آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس نے اٹھارہویں صدی ہی میں لنگوا فرانکا زبان کا درجہ حاصل کر لیا تھا۔ جبکہ انیسویں صدی میں اسے شمالی ہند میں ایک شائستہ اور مہذب زبان کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ فورٹ ولیم کالج کے بعد دہلی کالج نے اسے علمی زبان بنانے میں غیر معمولی کردار ادا کیا۔ عین اس زمانے میں جب اردو پڑھنے لکھنے کی زبان بن رہی تھی اسے سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہو گیا جس سے اس کی ترقی میں چار چاند لگ گئے۔ عدالتوں اور انتظامی دفاتر میں اس کو رائج کیا گیا اور پھر یہ زبان سیاسی، سفارتی اور محکمہ جاتی زبان بن گئی۔ اردو زبان کی اس ترقی کا سب سے زیادہ فائدہ اردو صحافت کو پہنچا۔ اس کے ساتھ اردو صحافت نے بھی اپنی توسیع و اشاعت کی مدد سے اردو کی مقبولیت میں اضافہ کیا۔

اردو صحافت کی ترقی کی ایک وجہ اس وقت لیتھوگرافی کا رواج بھی تھا۔ لیتھو کی چھپائی آسان بھی تھی اور سستی بھی۔ اس لیے اردو اخبارات لیتھو پر نکلنے لگے۔ اردو صحافت کی ترقی میں انگریز افسروں نے بھی حصہ لیا۔ اردو کے پہلے اخبار جام جہاں نما کو حکومت کی سرپرستی حاصل رہی ہے۔ انگریز افسران اردو اخبارات و رسائل کے اجرا میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انگریز حکومت ملک میں تعلیم کا فروغ اور خصوصاً مغربی علوم کی اشاعت چاہتی تھی اور اردو صحافت اس کا ایک موثر ذریعہ بن گئی تھی۔ انگریزوں کے علاوہ نوابوں اور والیان ریاست کی جانب سے بھی اردو صحافت کو فائدہ پہنچایا جاتا رہا ہے۔ والیان ریاست اردو اخباروں کی مدد سے اپنی ریاستوں میں تعلیم کے فروغ کی کوشش کیا کرتے تھے۔

اردو صحافت کی متعدد خصوصیات ہیں۔ سب سے بڑی خصوصیت اس کی حق گوئی، بیباکی اور بے خوفی ہے۔ اس نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہ فرنگی ظلم و استبداد کا زمانہ تھا۔ اردو صحافت کے سفر میں 1857 کی جنگ آزادی کا سنگ میل بھی ہے۔ اس وقت ہندوستانی شہریوں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت اور جوش و جذبات کا جو طوفان اٹھا تھا اس کا سرچشمہ اردو اخبارات کے صفحات پر لکھی جانے والی تحریریں تھیں۔ انگریز افسروں کی جانب سے ان اخباروں کے خلاف سخت کارروائی کی جاتی جو ان کے خلاف تیغ بے نیام بنے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود

ان اخبارات کے تیور میں کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ اردو صحافیوں کو حق گوئی، بیباکی اور بے خوفی کی قیمت بھی چکانی پڑتی تھی لیکن ان کے عزائم میں لغزش نہیں آتی تھی۔ آج بھی وہ اسی روش پر قائم ہیں۔ آج بھی ان کو اپنی حق گوئی کی قیمت چکانی پڑتی ہے اور آج بھی اردو اخبار خاموشی پر بولنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

اردو صحافت ہمیشہ احتجاج کی صحافت رہی ہے۔ ظلم کے خلاف احتجاج، ناانصافی کے خلاف احتجاج، بدعنوانی کے خلاف احتجاج، امتیازی رویے کے خلاف احتجاج، سماجی برائیوں کے خلاف احتجاج اور ہر اس عیب کے خلاف احتجاج بلند کرنا اس کا شیوہ اور وطیرہ رہا ہے جس کے دور رس مضر اور منفی اثرات مرتب ہوتے ہوں۔ بعض حلقے یہ شکوہ کرتے ہیں کہ اردو اخبارات میں احتجاج اور منفی پہلو کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ایسے لوگوں کو اردو صحافت کے مزاج کو سمجھنا ہوگا۔ اس کا مزاج حکومت و اقتدار کی حاشیہ برداری کرنا اور خوشامدانہ رویہ اختیار کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مزاج ہر قسم کی ناانصافی کے خلاف تیغ بے نیام بن جانا رہا ہے۔ الغرض احتجاج اردو صحافت کا طرۂ امتیاز ہے۔ اردو اخبارات نے کبھی بھی حکومتوں کی بیجا طرفداری نہیں کی۔ ان کی بیجا حمایت نہیں کی اور ظلم و زیادتی کے خلاف خواہ وہ کسی بھی پارٹی کی ہو، اس نے ہمیشہ آواز بلند کی ہے۔

اردو صحافیوں کو معلوم ہے کہ انہیں سادہ اور عام فہم الفاظ کا استعمال کرنا چاہیے۔ لہذا وہ سلیس اور عام فہم زبان ہی لکھتے ہیں۔ جن اخبارات نے عوام کے مزاج کو پہچان لیا ہے وہ کامیابی سے زینے طے کرتے ہیں اور عوامی مزاج یہی ہے کہ ایسی زبان لکھی جائے جو عوام کی سمجھ میں آسانی سے آ جائے۔ محسن علی تبریزی کے مطابق "آسان اور سادہ الفاظ کے استعمال کے ساتھ ساتھ جملوں کی ساخت اور ترکیب بھی آسان ہونی چاہیے۔ اضافت کا کم سے کم استعمال کرنا چاہیے اور طویل جملوں سے بچنا چاہیے۔ مختصر جملے بنانے چاہئیں"۔ جن صحافیوں نے یہ سیکھ لیا ہے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہیں۔ کچھ لوگ بڑے بڑے جملے اور ادق زبان لکھنے کو اپنی قابلیت سمجھتے ہیں جبکہ سادہ، آسان اور عام فہم زبان میں قابلیت اور صلاحیت کا امتحان ہوتا ہے۔ کم سے کم الفاظ اور کم سے کم جملوں میں اپنی بات کہہ دینا بہت بڑا فن ہے اور اردو کے بڑے صحافیوں میں یہ

خصوصیت موجود رہی ہے۔

اردو صحافت نے اپنی شناخت کو قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ عوامی موڈ اور عوامی مزاج کا ساتھ بھی دیا ہے۔ ایک اچھا صحافی صرف اس پر نظر نہیں رکھتا کہ اسے قارئین کو کیا پڑھوانا چاہیے اور کیا نہیں بلکہ اس پر بھی اس کی نظر ہوتی ہے کہ قارئین کیا پڑھنا چاہتے ہیں۔ اردو اخباروں نے بھی اس کا خاص خیال رکھا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے بھی پیش نظر رکھا ہے کہ عوامی مزاج کا موڈ چھاپنے میں کہیں کوئی ایسی بات نہ چھپ جائے جو معاشرے کے لیے نقصان دہ ہو اور جس سے سماج میں کوئی غلط مثال قائم ہو جائے۔ اردو صحافت سماجی اصلاح کا بھی کام کرتی ہے اور سماجی برائیوں کے خلاف آواز بھی اٹھاتی ہے۔

اردو صحافت کے نقوشِ اوّلیں

اردو صحافت کی ابتدا ''جامِ جہاں نما'' سے ہوتی ہے۔ یہ اخبار 27 مارچ 1822 کو کلکتہ سے نکلتا تھا۔ اس سے بہت [illegible] سے اخبارات منظرِ عام پر آ چکے تھے۔ اس کے مالک ہری دت اور مدیر [illegible] تھے۔ [illegible] سب سے پہلے [illegible] برائس کے [illegible] میں شائع ہوئی تھی۔ اس [illegible] انداز میں اس کی اشاعت کا ذکر کرتے ہوئے [illegible] کہ یہ اخبار ہندوستانی زبان میں جاری ہوا ہے۔ لیکن اس کا رشتہ کس سے [illegible] کس نے جاری کیا اس کے بارے میں کوئی بھی کچھ بھی نہیں بتا سکتا۔ [illegible] کا کوئی [illegible] پر مشتمل [illegible] مارچ کو شائع ہوا۔

جامِ جہاں نما

[illegible] میں نہیں [illegible] اس میں شائع ہونے والے [illegible] سے [illegible] اردو صحافت کے ابتدائی نقوش کا کچھ ہلکا پھلکا اندازہ [illegible] ہے۔ اس اخبار کا مقصد انگریزی صحافت نہیں تھا۔ چونکہ اس وقت تک انگریزی صحافت [illegible] میں تبدیل نہیں ہو پائے تھے لہٰذا اس میں مختلف قسم کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ان خبروں [illegible] میں تقسیم کیا جا سکتا ہے جو اس طرح ہیں۔ سیاسی خبریں، [illegible] خبریں، [illegible] دلچسپ خبریں، سائنسی خبریں، جنگی خبریں اور تعلیمی خبریں۔ اس وقت [illegible] سرخیاں نہیں لگائی جاتی تھیں بلکہ شہروں کے نام سے خبر دی جاتی تھی۔

لیٹ لائن کا رواج بھی اس وقت تک نہیں ہوا تھا۔ مثال کے طور پر ایک خبر کا عنوان ہے ''لکھنؤ کی خبر'' اس کے تحت اخبار لکھتا ہے:

''حکم ہوا کہ اگلے دن بھی رام لیلا کا تماشا دیکھا جاوے گا۔ چنانچہ دوسرے دن چکلے کی رنڈیوں اور بھانڈ بھگتیے بازی گر نٹ بھانتیوں نے گروہ کشمیریوں کے چھوکرے، غرض سب فرقے ارباب نشاط کے حکم کے مطابق کوٹھی دولت مبارک منزل کے سامنے اکٹھا ہوئے اور پادشاہی کارخانہ جات کے داروغہ ہاتھی گھوڑے آراستہ ہو کر حاضر ہوئے۔ امیری داس نائک شاہی نے رام لیلا کا تماشا شروع کیا۔ حضرت دیر تک تماشا دیکھا کیے۔ آتش بازی چھوٹا کی۔ سب کو جو مقدر تھا انعام ملا۔ امیری داس کو فقیروں کے بھنڈار کے لیے ہزاروں روپے مرحمت ہوئے''۔

اسی طرح ہولی کی خبر کے حوالے سے لکھا گیا ہے

ہولی کے دنوں میں روز گلال اور عبیر کے قمقمے اور رنگ بھرے ہوئے ظروف مندوں امیروں کے حضرت کے حضور میں پہنچتے تھے اور نذر دے کر نقد روپیہ اور دوشالے بارگاہ سلطانی سے انعام ہوتے تھے۔ شہر شہر کے بھانڈ عجب عجب نقلیں کر کے حضور کے انعام سے اپنی مراد حاصل کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ شہر کے رہنے والوں نے حضرت جہاں پناہ کی بدولت خوب کیفیت ہولی کی دیکھی اور طوائفوں کے ناچ سے ایسی حظ حاصل کہ بیان نہیں ہو سکتی''۔

جرم و سزا کی ایک خبر ملاحظہ ہو جس کا عنوان ہے ''لاہور کی خبر''

''جیت سنگھ داروغہ کے آتے ہی مہاراجہ رنجیت سنگھ نے فرمایا کہ شہر کے بنئے کس جرم میں قید ہوئے۔ میں نے جواب دیا کہ ان لوگوں نے غلے کا نرخ بہت بڑھا دیا تھا اور دن بدن بڑھاتے چلے جاتے تھے چنانچہ ایک دن غلے کی خرید و فروخت میں رعایا میں تلوار بھی چلی چند آدمی زخمی ہوئے۔ میں نے جو تحقیق کیا تو خریدار بے قصور تھے غریبوں کو کھانے کے لیے اناج نہ ملتا تھا۔ میں نے اپنے جی

میں سوچا کہ ایسی کوئی وقت نہیں آئی کہ جس سے نان تابنگا ہو کر تلاش سے نہ ملے اگر یہ بدذاتی چوروں کی ہے کہ اپنے فائدے کے واسطے مجھے بند کر رکھے ہیں ورنہ واسطے چشم نمائی ضروری ہوئی۔ چودھریوں کو قید کیا اور کہا کہ ابھی نرخ سے نان پکوا دو"۔

دوسری شہادت ایک خبر ملاحظہ فرمائیں جس کا عنوان ہے "اعجوبے کی خبر"

"خبر اس کاغذ سے ایسا معلوم ہوا کہ ایران کے ملک میں ایک رنڈی نے پیٹ سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ ایک کے دو سر اور چار ہاتھ تھے اور دوسرا سات دن تک جیا اس کے مرنے کے دو گھنٹے پیچھے دوسرا بھی مر گیا۔ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ سب حیران ہو کر کہنے لگے کہ ان دونوں کی صورت میں جو شکل نقش پا ایک ساتھ پیدا ہوئے تھے۔ مرنے میں بھی ساتھ نہ چھوڑا یہ تھی ایسی ہی چاہیے کیمبل کے ضلعے میں ویلی ایک گاؤں ہے وہاں ایک مہار کے گھر میں دو سر کا لڑکا پیدا ہوا۔ دونوں سر میں آنکھ، ناک، کان، منہ جو کچھ چاہیے موجود تھا"۔ (اس زمانے میں خبر کا عنوان دینا قاعدہ تو کچھ تھے کہ اخبار کے کاغذ سے معلوم ہوا)۔

ان دنوں میں بھی سائنسی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ایک خبر کا عنوان ہے "دھوئیں کا جہاز" ملاحظہ فرمائیں

"بہت دنوں سے یہ خبر مشہور تھی کہ انگلستان میں ایک جہاز تیار ہوتا ہے جس طرح ایک نادر چیز ہندوستان کلکتہ میں آئی کہ صرف دھوئیں کے زور سے چھ ہزار تار پر بے تکلف دریا میں چلی جاتی تھی۔ وہ جہاز اس طرح سب جتنے بحر محیط میں آمد و شد کرے گا اور اس جہاز کے بنانے والے انگلینڈ سے کلکتے پہنچنے کی پہچان مدت ٹھہرائی ہے کس واسطے کہ وہ جہاز پانی سے طاقت نہیں رکھتا جو ہوا کا تقاضا نہ ہوا اس کو تندی، طوفان موسم غیر موسم سب برابر ہے۔ بارے پچھلے ہفتے میں وہ جہاز ولایت سے آیا جس دن وہ کلکتہ پہنچا دریا کے کنارے بہت انبوہ جمع تھا اہل کمال حیران ہو کر کہتے تھے کہ سچ مچ دھوئیں کا جہاز ہے جو دھوئیں کے زور سے چلتا ہے یا کوئی طلسم دکھلائی دیتا ہے اس جہاز کے بنانے والے کو ہزار آفرین کہنا چاہیے۔ بشر کا یہ کام نہیں اگلے وقتوں میں کسی نے بنایا ہوتا تو بہت لوگ بھی

کہتے اس کے بنانے والے کے فرشتے مددگار تھے۔ اس نے دھوئیں کا جہاز نہیں بنایا۔ خلق کو اپنا معجزہ دکھایا۔ غرض جس قدر تماشائی لوگوں نے کہ اگر کبھی جمع ہوئے ایک دفعہ میں گنجائش نہ ہووے"۔ اسی طرح اور اسی زبان میں جنگی خبریں اور دوسری نوعیت کی خبریں شائع کی جاتی تھیں۔

آئینۂ سکندری

جام جہاں نما کے بند ہونے کے بعد "دہلی اردو اخبار" کے اجرا تک اردو کا کوئی باقاعدہ اخبار تو جاری نہ ہوا البتہ جدید تحقیق کے مطابق فارسی کے ایک اور اخبار کا سراغ ملتا ہے جو اردو ضمیمہ شائع کیا کرتا تھا۔ یہ بمبئی کا اخبار "آئینۂ سکندری" تھا۔ اس اخبار میں ایک خبر کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ اس کا عنوان ہے "خبر دار السلطنت لکھنؤ"

"تا ابد ملک شہ عادل رہے   رہے قائم ہمیشہ شاہ دیں پناہ

حضور پُرنور اشرف روشن الدولہ بہادر کے نام سے یوں ہوا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی مرتضیٰ کی شہادت کے روز تابوت جو حضرت عباس کے روضے میں سے جاتے ہیں اثنائے راہ میں بسبب مذہب کے دونوں فرقوں سے جنگ و جدل ہمیشہ ہوا کرتا ہے ایسا بندوبست کیجو کہ کوئی بات بے موقع نہ ہونے پاوے اور کسی زبان سے بری بات نہ نکلے۔ چنانچہ بموجب ارشاد فیض بنیاد کے خوب ہی کارپردازان اہتمام عمل میں آیا اور ساری رعیت کو امن و امان کا منہ دکھایا"

"بمبئی کی خبر" کے عنوان سے شائع ایک خبر یوں ہے

"کچھ کار خیر کر لے بہت کم ہے زندگی   نیکی نہ ہووے تجھ سے تو صد حیف زندگی

نامہ نگار (نمائندہ) بمبئی سے یہ خبر دیتا ہے کہ جو مجلس گداؤں، محتاجوں کی پرورش کے واسطے اوائل میں مقرر ہوئی تھی اس کی بعض تجویزیں رہ گئی تھیں سو ابھی جمعے کے روز نویں تاریخ اس مہینے کی مجلس میں تمام اکابران شہر جمع ہو کر یہ مقرر کیا جو صلاح کار مختار اس مجلس کے تھے ان کے نام یہ ہیں"۔ اسی طرح اس کی بیشتر خبریں کسی نہ کسی شعر سے شروع ہوتی ہیں اور بعض اوقات خبروں کے حوالے بھی دیے جاتے رہے ہیں۔

اردو صحافت اور 1857

1857 کی جنگ آزادی اردو صحافت کے حوالے سے سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس وقت تک شمالی ہند میں بھی اردو اخبارات شائع ہونے لگے تھے اور اس خطے میں اردو صحافت کا سنگ بنیاد مولوی محمد باقر نے رکھا تھا۔ انھوں نے 1837 میں "دہلی اردو اخبار" جاری کیا جو چار سال تک اردو کے واحد اخبار کی حیثیت سے نکلتا رہا۔ 1841 میں ایک اور اخبار طلوع ہوا جس کا نام "سید الاخبار" تھا اور اسے سید محمد خاں نے جاری کیا تھا۔ اس کے بعد ہندوستان کے مختلف شہروں سے بھی اردو اخبار نکلنے لگے۔ 1837 سے 1857 تک کے عرصے کو اردو صحافت کا پہلا دور کہا جا سکتا ہے۔ اس دوران کم از کم 121 اخبارات منظر عام پر آئے اور سب سے زیادہ دہلی سے (24) اخبار نکلے۔ اس کے بعد آگرہ، مدراس، لاہور، بنارس، بمبئی، لکھنؤ اور سیالکوٹ سے اخبارات جاری ہوئے۔

1857 کی جنگ میں اردو اخبارات نے جو نمایاں اور قابل فخر رول ادا کیا تھا وہ آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ جب بھی ہندوستان کی جنگ آزادی کی تاریخ رقم کی جائے گی اردو صحافت کی عظیم الشان قربانیوں کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔ ان کے ذکر کے بغیر نہ تو تاریخ آزادی ہند مکمل ہوگی اور نہ ہی اردو صحافت کی تاریخ نگاری کا حق ادا ہو سکے گا اور جب جنگ آزادی کے حوالے سے اردو صحافت اور اردو اخبار نویسی کا باب قلمبند کیا جائے گا تو مولوی محمد باقر کی قربانیوں کو فراموش کرنا آسان نہیں ہوگا۔ مولوی باقر نے اپنے خون کے چھینٹوں سے تحریک آزادی ہند اور تاریخ صحافت اردو کے اوراق کو لالہ زار بنا دیا تھا۔ انھوں نے اردو صحافیوں کے لیے ایک ایسا نقش راہ متعین کر دیا تھا جس سے گریز کی نہ تو کوئی صورت تھی اور نہ ہی اردو صحافیوں میں اس کی جرأت تھی۔

1857 میں دہلی سے تین اخبارات شائع ہوا کرتے تھے جن کے نام سراج الاخبار، صادق الاخبار اور دہلی اردو اخبار تھے۔ دہلی اردو اخبار نے حریت پسندی کی ایسی آگ بھڑکائی تھی

جو 15 اگست 1947ء تک نہیں بجھ سکی۔ سراج الاخبار آخری مغل تاجدار اور اپنے وطن میں دو گز زمین کی تڑپ لیے راہی ملک عدم ہو جانے والے بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا روزنامچہ تھا، جو فارسی میں ہفت روزہ شائع ہوتا تھا۔ اس روزنامچہ کا اردو ترجمہ صادق الاخبار اور دہلی اردو اخبار میں بھی پابندی سے شائع ہوا کرتا تھا جبکہ صادق الاخبار انتہائی تند و تیز اور انگریز دشمن اخبار تھا اور اس نے بھی ہندوستانی عوام کے دلوں میں آزادی کا ایسا جذبہ پیدا کیا تھا کہ اس کے آگے انگریزوں کے قدم لڑکھڑانے لگے تھے۔ اس کے ایڈیٹر کا نام سید جمیل الدین تھا اور مولوی ذکاء اللہ کے بیان کے مطابق بغاوت پھیلانے کے الزام میں جمیل الدین کو تین سال کی قید بامشقت کی سزا ہوئی تھی۔ جب آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے خلاف مقدمہ قائم کیا گیا تو عدالت میں اس اخبار کے شمارے خصوصیت کے ساتھ پیش کیے گئے تھے۔ مقدمہ کی سماعت کے دوران ایک سرکاری گواہ چنی لال کے مطابق یہ دہلی کا ایک منہ زور اخبار تھا اور شہر کے تمام طبقوں میں یکساں مقبول تھا۔

دہلی اردو اخبار

مولوی محمد باقر کے ہفت روزہ اخبار دہلی اردو اخبار کا مزاج 1857ء کی جنگ سے قبل کچھ اور تھا اور جنگ کے بعد کچھ اور ہو گیا۔ صحافت اردو کے ایک غواص عتیق صدیقی کے مطابق بغاوت شروع ہونے کے وقت تک اس اخبار کا انداز دیگر اخباروں کے برعکس ''امن پسندانہ'' تھا۔ خبروں کا انداز اور ان کی پیش کش کا طریقہ کار سیدھا سادہ اور عام سا تھا۔ کسی خبر سے نہ تو انگریز دشمنی کی بو آتی تھی اور نہ ہی کسی قسم کی بے اطمینانی کا اظہار ہوتا تھا بلکہ بسا اوقات دہلی اخباروں میں شائع ہونے والی گرم خبروں کی تردید بھی یہ اخبار کیا کرتا تھا۔ 12 اپریل 1857ء کے شمارے میں اخبار لکھتا ہے ''یہ مقام بے غور اور قیاس کا کہ عوام کالانعام بازار میں لوگ جو گپ ہانکتے تھے اور شہر میں لوگوں کی زبان پر تھا کہ بہترین سپاہ برگشتہ ہو رہی ہے اور مقابلے کو موجود ہے، سراسر وہ باتیں لغو اور بے اصل تھیں۔ اس قسم کی بہتیری خبریں درباب لکھنؤ اور جنگ ایران وغیرہ امور پر روز نئی نئی طرح کے سنے جاتے ہیں بلکہ لکھے جاتے ہیں لیکن اصلی تحقیق قابل حکم قطعی و تصدیق نہیں ہوتے''۔

لیکن مئی 1857ء میں میرٹھ سے بغاوت کی جو چنگاری اٹھی تھی، اس کے شعلہ جوالہ بن جانے اور پورے ملک میں شدت اور حدت پیدا کر دینے کے بعد اس اخبار نے جوش و ولولہ کا وہ صور پھونکا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ چنگاری کے شعلہ بننے کے بعد اخبار نے لکھا کہ انگریز ہزار بلکہ ہر طرح سے بہروپ بھریں اب کسی طرح نہیں پنپتے، کیونکہ خدا کی مار کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ پھر اس کے بعد تو اخبار کے رنگ روپ اور انداز و طور میں ایک انقلاب برپا ہو گیا اور وہ یوں للکارنے لگا کہ "اب کہاں ہیں انگلش مین اور فرینڈ آف انڈیا اور وہ ترانیاں حکمت و حکومت و دانائی کی، کانسٹیٹیوشنوں کی۔ اب دیکھیں کہ شہر و دیہات کے ہندوستانیوں نے بے جراتوں، بے دانوں نے اور بے عزموں اور بے ہمتوں نے انگریزوں کے اہل حکمت و اہل جرأت صاحبان عزم و ارادہ کو کس نوبت کو پہنچا دیا۔"

دہلی پر جب دوبارہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو جن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ان میں مولوی محمد باقر بھی تھے۔ عتیق صدیقی کے مطابق مولوی محمد باقر کی شہادت کا تعلق ہڈسن سے نہیں دہلی کالج کے پرنسپل ٹیلر کی موت سے تھا جسے مولوی محمد باقر نے اپنے گھر میں پناہ دی تھی۔ تاہم مولوی باقر کی شہادت کا ہڈسن سے تعلق نہیں ہو سکتا۔ "1857 کے اخبارات اور دستاویزیں" میں عتیق صدیقی اور مولوی ذکاء اللہ کی "تاریخ" میں مولوی ضیاء الحق نے لکھا ہے کہ مولوی محمد باقر کو ٹیلر کی موت کے سلسلے میں شہید کیا گیا تھا۔ جس رات کی رات ٹیلر نے مار کر بھی مولوی محمد باقر کو دھوکا دیا جس کے نتیجے میں انہیں اپنی جان گنوانی پڑی۔ بیشتر محققین و مورخین بھی اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ مولوی محمد باقر کی شہادت ٹیلر کی موت سے جڑی ہوئی ہے۔

مولوی ضیاء الحق کہتے ہیں "پرنسپل ٹیلر صاحب کالج سے بھاگتے ہیں آئے اور اپنے بڑے خاندانوں کی خبر لینے گھس گئے۔ لوگوں نے انہیں مولوی محمد حسین آزاد کے والد کے گھر پہنچا دیا۔ مولوی محمد باقر کی ان سے بڑی گاڑھی چھنتی تھی۔ انھوں نے ایک رات ٹیلر صاحب کو امام باڑے کے تہہ خانے میں رکھا لیکن دوسرے دن جب امام باڑے میں چھپنے کی خبر محلے میں ہوئی تو مولوی صاحب نے ٹیلر کو ہندوستانی لباس پہنا کر چلتا کیا۔ مگر ان کا بڑا افسوسناک انجام ہوا۔ بیرم خان کی کھڑکی کے پاس جب اس ڈھنگ سے پہنچے تو لوگوں نے پہچان لیا

اور اتنے لٹھ برسائے کہ بے چارے نے وہیں دم توڑ دیا"۔

مولوی محمد حسین آزاد نے اس واقعہ کی تفصیل لکھی ہے ان کے مطابق "جب ٹیلر کو مولوی باقر نے نکال دیا تو اس سے کچھ دیر قبل ٹیلر نے کاغذات کا ایک بنڈل ان کے حوالے کیا اور کہا کہ دلی پر انگریزوں کا دوبارہ تسلط ہو جائے تو پہلا انگریز جو تمھیں نظر آئے یہ بنڈل اس کے حوالے کر دینا۔ مولوی صاحب کو اس کی خبر نہ تھی کہ اس بنڈل کی پشت پر ٹیلر نے لاطینی زبان میں کچھ لکھ بھی دیا ہے۔ جب دلی پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا تو مولوی صاحب نے وہ بنڈل ایک انگریز کرنل کے سامنے پیش کر دیا۔ ان کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہی ان کی موت کا حکم نامہ ہے۔ ٹیلر نے لکھا تھا کہ مولوی محمد باقر نے شروع میں ان کو اپنے مکان میں پناہ دی لیکن پھر ہمت ہار دی اور ان کی جان بچانے کی کوشش نہ کی۔ کرنل نے بنڈل الٹ پلٹ کر دیکھا اور مولوی صاحب کو فوراً گولی مار دی اور ان کی جائداد بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔"

دہلی اردو اخبار میں جنگ آزادی کی تفصیلات پابندی سے شائع ہوتیں اور دہلی شہر کے علاوہ دیگر شہروں کے احوال بھی بے کم و کاست بیان کیے جاتے تھے۔ 1857ء کی ناکام جنگ کے بعد اس اخبار نے پالیسی تبدیل کر دی اور اب صرف اور صرف حریت پسندوں میں جوش و ولولہ پیدا کرنے کے لیے وقف ہو گیا تھا۔ اخبار میں ہندوستان کے کونے کونے سے مجاہدین کی خبریں پہنچتیں اور ان کی کامیابیوں کی رپورٹیں شائع ہوتیں۔

31 مئی 1857 کے شمارے میں اخبار لکھتا ہے "ابھی تک انگریز روز و شب ایک دو چھپے چھپائے نکلتے آتے ہیں اور پکڑ کر مارے جاتے ہیں۔ ہر روز، ہر ساعت اور ہر لمحہ چشم عبرت بیں و نصیحت سے نمونہ قدرت الٰہی کا نمودار ہے۔ ایک شخص خربوزہ فروش کی دکان پر منہ چھپائے خربوزہ خریدنے کا بہانہ کرتا اور کبھی خریدار بنتا تھا، ایک دوسرے پر پیش قدمی کرتا تھا۔ وہ شخص جو منہ چھپائے تھا سب کو شبہ ہوا، کہ تم چپ رہو گے۔ یہ کلمہ سنتے ہی سب لوگ متنبہ ہوئے کہ یہ انگریز ہے۔ فوراً بازار کے لڑکوں نے چاروں طرف سے مار لیا۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ ایسا ڈیل ڈول قوی ہیکل وہ فرنگی تھا کہ ایک دفعہ تو دو آدمیوں کو بھی پیٹ جاتا تو غالب ہو بیٹھتا۔ لیکن نمونہ قہر الٰہی اسے جاننا چاہیے کہ اصلاً اور مطلقاً دم مارنے اور انگلی ہلانے کی جرأت بھی خدا نے

قہر نے ان سے سہ دی ہے۔" اس شمارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ "چار انگریز مرزا حسن کے مقبرے میں پوشیدہ تھے، ایک سقے نے دیکھ لیا (گوروں نے) اسے مار ڈالا۔ آخر تلنگے خبر پا کر جا پہنچے اور ان انگریزوں کو مار ڈالا۔ ایک فرنگی رات کو مکان دہلی گیٹ کی طرف پھرتا تھا۔ چوکیدار وغیرہ لوگوں کے ہاتھوں آناً فاناً داخل نیران ہوا۔ ہر روز ایک دو اس طرح مارے جاتے ہیں اور ایسے خائف و مرعوب ہیں کہ بیان سے باہر ہے۔"

اس اخبار میں ملک بھر میں ہونے والے ان واقعات کو شائع کیا جاتا جن سے مجاہدین کی رگوں میں گردش کرنے والا خون اور تیز ہو جاتا۔ میرٹھ کی ایک خبر میں رقمطراز ہے کہ "سنا گیا ہے کہ بعض آدمی وہاں سے آئے بیان کرتے ہیں کہ میرٹھ میں گورکھوں کی پلٹن بھی بگڑ گئی انگریزوں کو مار ڈالا، کوتوال کو بھی مارنا چاہا تھا، بسبب نیک بختی اور مسلمان ہونے کے جاں بخشی ہوئی۔"

14 جون کے اخبار میں آگرہ کے بارے میں ہے کہ آگرہ میں بھاگی ہوئی انگریز سب قلعہ میں محصور ہو گئے تھے۔ سب چھاؤنی مسدود اور باہر آگرہ کے لوٹ مار ہونے لگی تھی۔

صادق الاخبار

دہلی اردو اخبار کی مانند صادق الاخبار بھی حریت پسندوں اور مجاہدین آزادی کی رگوں میں دوڑنے والے خون کو گرم کرنے کی خبریں شائع کرتا اور ان خبروں کو پڑھ کر لوگوں میں بے پناہ جوش و جذبات ابھر جاتے۔ یہ اخبار مجاہدین کے حوصلوں کو مہمیز دینے کے لیے خوابوں کی بھی اشاعت کرتا تھا۔ صادق الاخبار کے 14 ذی الحجہ 1273 ہجری کے شمارے میں ایک خواب بیان کیا گیا ہے۔ اخبار لکھتا ہے "ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ان دنوں میں نے یہ خواب دیکھا ہے کہ ایک بزرگ متبرک صورت میرے پاس آئے اور کہا کہ تم دل کس سے اتنا ڈرتے ہو۔ قادر مطلق نے بادشاہت ہند ابوظفر محمد سراج الدین بہادر بادشاہ غازی کے نام عطا کر دی۔ میں یہ سن کر شکر خدا بجا لایا اور استفسار کیا کہ حضرت یہ تو فرمائیے کہ آپ کے ہاتھ سیاہ کیوں ہو گئے۔ بہ جواب اس کے وہ خضر صورت ملک سیرت بولے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ خدمت دی کہ تمہارے دشمن جب تم پر گولہ برساتے ہیں تو میں ہاتھوں پر روکتا ہوں اور یہی باعث ہے کہ رعایا دہلی میں سے کم ضائع

ہوتے ہیں۔ ورنہ یہ امکان تھا کہ اس خواب کے سلسلے میں خود بھی رائے قائم کی جا سکتی کہ
اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نے اس وقت مجاہدین کے ذہن میں نیا ولولہ پیدا کر دیا ہوگا۔

''خبر فتح لکھنؤ'' کے عنوان سے اخبار لکھتا ہے ''آج ایک [illegible] سے پہنچا کہ [illegible] آیا وہ خبر [illegible] کہ لکھنؤ سے مع انگریزوں و وہاں کی فوج نے تمام قلعے پر [illegible] اور [illegible] وغیرہ [illegible] میں قبضہ اپنا کر لیا اور سپاہ کا ارادہ ہے کہ [illegible] صاحب [illegible] کو [illegible] پر [illegible] اس [illegible] چھوڑ دیے اور زیارت [illegible] اس کا [illegible] [illegible] کہ پوشیدہ [illegible] قید و [illegible] برکات اور [illegible] وغیرہ [illegible] سے غرض قتل کرنے [illegible] اپنے [illegible] میں اور [illegible] وغیرہ [illegible] حضور نے بعد خوش ہونے کے جواب با صواب ان [illegible] کا [illegible] نہیں [illegible] کہ تھوڑے دنوں میں [illegible] ہوں گے [illegible] خبر میں لکھنؤ میں فوج سے [illegible] ہونے اور انگریزوں کو قتل کرنے اور بعض مقامات پر قبضہ کرنے کی اطلاع دی گئی ہے۔ ساتھ ہی [illegible] سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس فوج نے بادشاہ [illegible] میں [illegible] خواہش ظاہر کی تھی جو پوری ہو گئی۔

[illegible] خبریں [illegible] اخبار میں خوب چھپی تھیں۔ جس شہر کی خبر ہوتی اس شہر کے نام سے [illegible] 1273ھ کے مطابق [illegible] اخبار کے شمارے میں ایک بہت سی خبریں شائع [illegible] ہیں۔ [illegible] یہ خبر [illegible] اس وقت خون خراب [illegible] [illegible] ہر طرف سے [illegible] خدا تعالیٰ اپنا فضل و کرم عطا کرے اور [illegible] وجہ فتح [illegible] ایک [illegible] خبر [illegible] دہلی میں چھپی مطلق العنانی اور لوٹ مار کی رپورٹنگ اس انداز [illegible] خوب [illegible] اور [illegible] پوشیدہ [illegible] انگریز [illegible] خوب [illegible] [illegible] کا [illegible] خصوصیت سے [illegible] و [illegible] مشورہ [illegible] اور جرنیل صاحب بہادر [illegible] میں [illegible] کہ [illegible] سوار ان [illegible]

سب تک کسی طرح رعایا کو تکلیف نہ ہو اور بندوبست شہر بخوبی رہے۔ اسی شمارے میں یہ اطلاع بھی تھی۔ "چودھویں ذی الحجہ کو سواری حضور شہنشاہ ہند کی بڑے کروفر سے ہوئی۔ ایک خلقت برائے زیارت جمع تھی۔ اس ہفتے میں کئی لڑائیاں سپاہ اسلام کے غنیم بد اطوار سے یہاں تک ہوئے کہ ان کو جیسا کہ چاہیے سب تھوڑے باقی رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو مجاہدین اور افواج ظفر امواج ان کو فی النار کریں گے۔"

ان خبروں سے تو صادق الاخبار کے بارے میں سرکاری گواہ جیون لال کے اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ دہلی کا ایک مشہور اخبار تھا۔ ذرا غور کیجیے کہ کس طرح ان خبروں میں انگریزوں کو غنیم بد اطوار اور داخل فی النار جیسے القاب و آداب سے نوازا گیا ہے۔ یہ اندازہ لگانا بھی مشکل نہیں ہے کہ جب مسلمان ان خبروں کو پڑھتے رہے ہوں گے تو ان کے دلوں میں کس طرح جوش و جذبات کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا ہوگا۔ ان خبروں کے زبان و بیان اور اسلوب و انداز سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ 1857ء کی جنگ میں مسلمانوں نے کس طرح بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔

سراج الاخبار

اب چند نمونے بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے سے ملاحظہ فرمائیں۔ اس روزنامچے کا نام سراج الاخبار تھا۔ 10 اگست 1857ء کے اخبار میں ایک خبر یوں ہے: "تمام پیدل و سواروں نے جرأت میدان جنگ چاہی۔ اور روز سہ شنبہ اطراف دہلی میں جوانمردی و جرأت و مردانگی دی اور حق دلاوری ادا کیا۔ سوار اور پیادگان نے خوب جنگ آوازی و شجاعت و مردانگی فوج ظفر موج دم بدم کرتے تھے۔" بہادر شاہ ظفر کے روزنامچے یعنی سراج الاخبار میں بیشتر خبریں قلعہ معلی کی ہوتی تھیں۔ بادشاہ معاملات سلطنت اور شہزادوں کی سرگرمیوں سے یہ اخبار زیادہ روبرو کراتا تھا۔ جیسا کہ اس کا نام بہادر شاہ کا روزنامچہ ہے لہٰذا اس میں روزنامچے کے مزاج کو برقرار رکھا گیا تھا۔ تاہم جنگ آزادی سے متعلق خبریں بھی اس میں خاصی ہوتی تھیں۔

1857ء کی جنگ کا آغاز مئی میں ہوا تھا اور 30 مئی، ششم شوال کے اخبار میں بادشاہ کے

حج کرنے کی خواہش اور نیت کے بارے میں ایک خبر شائع ہوئی ہے۔ خبر کے مطابق حضور اقدس نے تمام فرزندان نامدار کو طلب فرما کر ارشاد کیا کہ نیاز مند درگاہ کو بہ سبب انحراف و اعراض سپاہ کے چاہتا ہے کہ پایہ تخت حکومت سلطنت کو خیر باد کہے اور ترک لباس اور دلق خاکستری کو بجائے فرماں روائی پر ترجیح دیتا ہے اور ارادہ ہے کہ اول درگاہ حضرت خواجہ صاحب قدس سرہ میں فائز ہو اور پھر مشرف بہ آستان کرامت نشان حرمین شریفین ہو۔"

15 رشوال 8 جون کی ایک اور خبر ملاحظہ فرمائیں جس میں جنگ آزادی کا ذکر موجود ہے۔

"عرض ہوا کہ فوج انگلستان تا آمد متصل پورے اہل شکر موروثی نے قریب دو دمدمہ کے، مگر آخر فوج منصورہ نے انھیں پسپا کیا اور دو دمدمے لے لیے، بوجہ سرعت ادائیگی سامان رسد کے لیے تاکید ارشاد ہوئی اور ایسے جھنڈے ہمت سے ختم مقام رہے۔ سواران تلنگوں نے ایسی شجاعت و مردانگی دی کہ بیان و کان میں نہیں آتی اور بہت خستہ و کشتہ ہوئے۔"

اس طرح 1857ء میں دہلی سے ان تینوں اخبارات دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار اور سراج الاخبار کی خبروں کے چند نمونوں سے بآسانی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ اخبارات کس طرح مجاہدین آزادی کی رگوں میں گردش کرنے والے خون کی حدت اور شدت میں اضافہ کرتے تھے اور کس طرح ان میں حریت پسندی کا جذبہ بیدار کرتے تھے۔ اگر ان اخبارات کے زبان و بیان اور ان کے طرز و اسلوب کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ دہلی اردو اخبار انتہائی سادہ اور آسان زبان میں اپنی بات کہتا رہا مگر اس سادگی پسند انداز میں بھی حریت پسندوں کا تیور نمایاں طور پر موجود ہے۔ جس کو بخوبی محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اس سادہ اسلوب نگارش میں بھی بلا کی گرمی تھی جو آزادی کی چنگاریوں کو بجھنے نہیں دیتی تھی۔ جبکہ سید جمیل الدین کے صادق الاخبار میں انتہائی بھاری بھرکم اور پرشکوہ الفاظ کا استعمال ہوتا تھا اور بہت حسن طریق کے ساتھ مجاہدین آزادی کے جرات مندانہ کارناموں کا ذکر ہوتا تھا۔ جہاں دہلی اردو اخبار میں برجستگی تھی وہیں صادق الاخبار میں بھاری بھرکم الفاظ اور پرشکوہ جملوں سے گرمی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ بلاشبہ اس کی منہ زوری میں اتنی شدت تھی کہ جس نے انگریزوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کے مدیر کو قید بامشقت کی سزا دیں۔ لیکن انھوں نے مولوی باقر کے ساتھ آزادی کی جو آگ لگائی تھی وہ اتنی مدھم

[illegible] شمس الدین کی قید و بند اور مولوی باقر کی موت سے بجھ جاتی۔ 1857 کے انگریزی اخبارات [illegible] حاشیہ برداری کرتے تھے اور دیسی اخباروں کو پریس [illegible] اخبارات اپنی [illegible] تعداد اشاعت سے [illegible] تھے۔ ایسا طوفان جس پر [illegible] تک [illegible] پورے ملک میں ایک سیلاب امڈ پڑا اور پھر یوں [illegible] وقت [illegible] مملکت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ [illegible] قدر [illegible] اور [illegible]

اخبار جمہور

[illegible] اور [illegible] میں کافی [illegible]

[illegible] 1918 میں [illegible] اور [illegible]

[illegible] تھے۔

[illegible] کہتے ہیں کہ [illegible] ”جمہور“ [illegible] زیادہ مشہور و مقبول تھی

عبدالغفار کا "جمہور" جو برطانوی آمریت واستبداد سے ٹکراؤ اس اخبار کا تعارف ہے جس کا فائل اب ہندوستان کی کسی لائبریری میں دستیاب نہیں۔ 1918ء میں جمہور کے ضبط ہو جانے کے بعد اس کے بھی شمارے ضائع کر دیے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ فائل "جمہور" کے ایک خریدار نے اپنے پاس محفوظ کر رکھا تھا جسے بعد میں [illegible] مدیر قاضی عبدالغفار مرحوم نے قیمتاً حاصل کیا۔ اس فائل پر میں نے [illegible] قریشی (افضل [illegible]) [illegible] یہ فائل مجھے بیگم قاضی عبدالغفار [illegible] کی بیٹی فاطمہ عالم علی صاحبہ کی وساطت سے حاصل ہوا اگرچہ یہ انتہائی خستہ حالت میں تھا۔ ابتدائی تاریخوں کے چند شمارے فائل میں موجود نہیں ہیں اور یہی صورت آخری چند شماروں کی بھی ہے۔ "جمہور" کا آخری [illegible] چھپا [1] [illegible] شائع ہوا تھا۔

مدیر جمہور کا خاندانی پس منظر

"جمہور" کی ادارت سے پہلے قاضی صاحب کے انتخاب کی معقولیت و ثقاہت سے پہلے ان کے خاندانی پس منظر، ذہنی تربیت سازی کے بنیادی عوامل پر اتفاقاً توجہ [illegible] ہوگی۔ قاضی صاحب جس [illegible] [illegible] [illegible] ان کے [illegible] قومی جنگ آزادی کا ایک [illegible] کا ایک درخشاں باب ہے۔ قاضی صاحب کی پیدائش 1889ء میں مراد آباد کے ایک خوشحال گھرانے میں ہوئی۔ ان کے دادا قاضی حامد علی کو 1857ء کی بغاوت میں انگریزوں نے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ تفصیل ان ہی کی زبانی سنئے

"جب دلی میں غدر ہوا تو اس وقت ہمارے دادا (قاضی حامد علی) مراد آباد کے قاضی تھے اور ہمارے والد کی عمر اس وقت تیرہ برس کی تھی۔ دلی کے قلعہ میں ہنگامہ برپا تھا۔ اس قیامت میں ایک شہزادہ قلعہ سے بھاگ کر مراد آباد کی طرف آ نکلا۔ [illegible] کسی کا [illegible] شہزادے کو پناہ

دیتے تو بیٹا نہ تھی۔ ہمارے دادا کو جب معلوم ہوا تو انھوں نے شہزادے کو اپنے یہاں چھپا لیا۔ انگریزوں کے جاسوس چاروں طرف پھیلے ہوئے تھے، کسی نے خبر کر دی کہ مراد آباد کے قاضی نے شہزادے کو پناہ دے کر غداری کی ہے۔ شہر میں کھلبلی مچ گئی۔ ہمارے دادا کے دوست احباب گھبرائے ہوئے آئے اور کہا "قاضی جی آپ نے یہ کیا غضب کیا۔ اب آپ کی خیر نہیں۔ خدا کے لیے روپوش ہو جائیے۔ آپ پر غداری کا الزام لگ چکا ہے"۔ مگر قاضی جی نے صاف انکار کر دیا اور کہا "میں نے غداری نہیں کی، وفاداری کی ہے۔ جو ہوگا دیکھا جائے گا"۔

چنانچہ ہمارے دادا مسجد میں عصر کی نماز پڑھ رہے تھے۔ انگریزوں نے ان کو پکڑ لیا اور آناً فاناً پھانسی دے دی۔ اس کے بعد حکم ہوا کہ ہماری دادی کو بچوں کے گھر سے نکال کر مکان اور جائداد ضبط کر لی جائے۔ انگریزوں کے ظلم و ستم سے ہر شخص ڈرتا تھا۔ قاضی جی کی بیوہ کو پناہ دینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ ان کے عزیزوں نے بھی رات گزارنے کے لیے جگہ نہ دی۔ آدھی رات کا وقت تھا۔ کسی نے دروازے پر دستک دی۔ ہمارے گھر والوں کی جیسے جان نکل گئی لیکن مسلسل دستک کی آواز پر دروازہ کھولا تو معلوم ہوا کہ ایک [illegible] ہے، کہتی ہیں قاضی جی کی بیوہ سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ ہماری دادی نے دروازے کی اوٹ سے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا "آپ قاضی جی کی بیوی ہیں، آپ سب فوراً شہر چھوڑ دیں، ان سے بچنے کی یہی صورت ہے"۔ ہماری دادی نے کہا "بیٹی آدھی رات کو کہاں جاؤں، بچے ہیں، عورت ذات ہوں، کیا کر سکتی ہوں"۔ اس نے ہمت دلائی اور کہا "آپ چلیے، میں کوشش کروں گی، کوشش کرنے ہی سے راستہ ملتا ہے"۔ اس زمانے کی عورتیں جنھوں نے زمانہ دیکھا تھا کس قدر ہمت والی تھیں، وقت پڑ جانے پر مردوں سے زیادہ ہمت والی ہوتی تھیں۔ غرض ہماری دادی اپنے بچوں کے ساتھ جہاں سے نکالی گئی تھیں وہاں پہنچیں اور بڑی مشکلوں میں سے ہوتے ہوئے شاہجہاں پور پہنچیں۔ وہاں ایک [illegible] تھا اور [illegible] شاہی کے طور پر ایک [illegible] گاڑی [illegible]۔ اس کے بعد جب [illegible] اور ہمارے دادا بے قصور ثابت ہوئے، تو انگریزوں نے بڑی عنایت کی کہ مکان اور جائداد واپس کر دی، بلکہ کچھ انعام بھی دیا۔ لیکن اس وقت ہمارے دادا کی قبر بھی نہ مل سکی کیونکہ دفن کرتے وقت کسی کو یہ ہوش نہ تھا کہ کس طرف [illegible]۔ چنانچہ اس [illegible] کی مدد سے قبر پہچانی گئی اور پختہ قبر بنا دی

گئی اور حشر کا میدان ہمارا خاندانی قبرستان بن گیا"۔

قاضی عبدالغفار کے والد قاضی ابرار احمد نے اپنے والد کی سنت سے انحراف کیا۔ قاضی ابرار احمد کو انگریز سرکار سے خان بہادر کا خطاب عطا ہوا تھا اور پنشن بھی۔ قاضی عبدالغفار کی صاحبزادی فاطمہ علی کے بقول "اپنے دادا کے چند خطوط جو انگریز کلکٹروں اور کمشنروں نے انھیں لکھے تھے میری نظر سے گزرے جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی ابرار احمد انگریزوں میں کافی مقبول اور ان کی سرکار میں خاصا عمل دخل رکھتے تھے۔ ایک طرف خان بہادر ابرار احمد کی انگریزی سرکار سے وفاداری اور دوسری طرف قاضی عبدالغفار کا انگریز سرکار کے ساتھ حقارت آمیز رویہ! ایک ہی چھت کے نیچے دو متضاد مزاجوں کا یہ ٹکراؤ سمجھنا ذرا مشکل ہے۔

قاضی صاحب کی صحافتی نگارشات میں غیر ملکی استحصال کے خلاف بلند صدائے احتجاج نیز حاکم و محکوم کے امتیاز پر شدید غم و غصے کا اظہار خصوصی طور پر نمایاں ہے۔ ان کی اخبار نویسی کی ابتدا سولہ سال کی عمر میں ہوئی۔ یہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ مراد آباد سے احمد علی صاحب کی ادارت میں "نیر عالم" نکلتا تھا جس میں ان کا تحریر کردہ ایک خبرنامہ شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد یہ متعدد اخباروں میں لکھتے رہے۔ صحیح معنوں میں اخبار نویسی کی ابتدا 1913ء میں ہوئی جب مولانا محمد علی جوہر نے دہلی سے "ہمدرد" نکالا۔ 1914ء میں مولانا محمد علی کو نظر بند کر دیا گیا تو قاضی صاحب نے مولانا محمد علی کے اشارے پر کلکتے سے "جمہور" نکالا۔ قاضی صاحب نے اپنے ایک اداریے میں اس کا اعتراف واضح طور پر کیا ہے۔ لکھتے ہیں "جمہور" ہمدرد مرحوم کا ایک دھندلا سا عکس ہے۔ ایک چراغ جلا کر رکھ دینے سے وہ محفل کیوں کر پیدا ہو سکتی ہے جس میں شمع کافوری روشن ہوا کرتی تھی۔ تاہم دل میں جو سکت ہے اور جگر میں جو ٹھنک ہے وہ اس محفل کی یادگار ہے جو بچھڑنے سے پہلے جمی تھی۔ اس موسم بہار کا نشان ہے جو گزر چکا ہے۔ ہمدرد مرحوم کی یاد دل و جگر کو عزیز ہو کم ہے اس لیے کہ وہ ایڈیٹر "جمہور" کی زندگی کا پہلا نشان تھا"۔

حکومت مغربی بنگال کے محافظ خانے میں موجود سرکاری رپورٹ برائے اخبارات 1917، (6) (1-18-129) میں "جمہور" کی پالیسی کے متعلق درج ہے کہ "اس کے خیالات بالکل وہی ہیں جو شدید انتہا پسند مسلمانوں کے ہیں۔ یہ انڈین نیشنل کانگریس، ہوم رول لیگ اور

[illegible] سیاست سے [illegible] تعلق [illegible]۔

[illegible] ہندوستانی سیاست کا انتہائی پُرآشوب زمانہ تھا اور اپنے سیاسی [illegible] جب یہ جنگ آزادی کی تاریخ میں مخصوص حیثیت کا حامل ہے۔ "جمہور" کا یہ [illegible] تمام [illegible] اور اس کے [illegible] 1918 [illegible] حیثیت [illegible] رکھتے ہیں۔

قاضی صاحب [illegible] سے تربیت یافتہ تھے اور "ہمدرد" میں ان کے ساتھ کام بھی [illegible] "ہمدرد" کی اعلیٰ صحافتی قدروں کی پیروی کرتے [illegible] صحافتی دیانتداری کو ایک نیا [illegible] صحافتی [illegible] زندگی صحافیوں [illegible] رفتار میں [illegible] مستعد [illegible] کے اختیارات کے سبب تمام حریت سے [illegible] آزمائشوں نے عوام کی [illegible] صحافتی دیانت داری کی اعلیٰ پاکیزہ اقدار کو قائم رکھنا انہی عہد ساز [illegible] اور قاضی [illegible] ذریعے اس جہاد میں ہمیشہ مصروف رہے۔ یہیں [illegible] کامیاب اخبار تھا جس کی تعداد اشاعت [illegible] تھی۔

[illegible] "خبار [illegible] جمہور [illegible] مرتب کیے اور قاضی [illegible] ایک خوبصورت کتاب [illegible] میں

ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے

ہندوستان کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے کہ معاملات ملک میں ہمیں بھی عملی حصہ ملنا چاہیے۔ ہم بھی تو آخر اس ملک کی سرزمین پر رہتے ہیں جس پر تم رہتے ہو۔ [illegible] حکومت فرماں روائی [illegible] تم [illegible] اور اپنے برابر نہیں سمجھتے تو کم از کم ہمارے جائز [illegible] بھی حقوق ہی دے دو۔ ان صاحب کا جواب ہمیشہ انہی الفاظ میں دیا جاتا ہے کہ "ابھی مہربانی کا وقت نہیں آیا" اور جب ان سے مشتعل [illegible] صاحب دراز کرتے ہیں تو ان کا [illegible] واپس نہیں کیا جاتا اور اس پر لطف یہ کہ ہم سے ہماری ناکامی [illegible] کامیابی کی داد چاہی جاتی ہے۔

یہ بھی [illegible] ہے [illegible]

[illegible] وہ مجھ کو دعا کے ساتھ

ہندوستان کی طرف سے حکومت [illegible] کا سوال جو [illegible] ہو رہا ہے تو اس پر پہلے خود [illegible] سے ان سے [illegible] متعلق اقتدارات دیئے جا رہے ہیں [illegible] ہوتے ہیں [illegible] کی ملت چھوڑ دینے سے [illegible] ہو جاتے ہیں لیکن ہمارے مہربانوں اور عنایت فرماؤں کی ایک جماعت ایسی بھی ہے جس کو نہ ملک کی حکومت میں دخل ہے اور نہ ہندوستانیوں کی [illegible] اور [illegible] سے کوئی نقصان پہنچتا ہے۔ [illegible] ان [illegible] ہندوستانیوں کے حقوق [illegible] حکومت خود اختیاری [illegible] ہم ووٹ [illegible] کاٹ دیا ہیں [illegible] ہیں غریب ہیں اور مفلس ہیں اور ہم [illegible] ہیں [illegible] ہندوستان کی سرزمین پر تجارت کرتے ہیں اور [illegible] اس طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کے ہاتھوں میں ہندوستان کی قسمت کی باگ ہے۔ لیکن ان کا جواب [illegible] دیا جاتا ہے اور ان سے سوال کیا جاتا ہے کہ تم کو کیا حق ہے کہ ہمارے [illegible] کے راستہ میں روڑے اٹکاؤ تو آخر [illegible] جواب [illegible] اعتراض [illegible] ہوتا ہے [illegible] کیا جاتا ہے اور اسی اعتراض پر ہمارے مہربان انگلو انڈین تاجروں کی جماعت [illegible] ہے اور ان کے خیال میں یہ ایسا اعتراض ہے کہ جس پر کسی طرح کا جوابی اور منطقی حملہ ہو ہی نہیں سکتا اور وہ اعتراض یہ ہے کہ

ہندوستان کی سرزمین پر انگلستان کی دولت بطور سرمایہ تجارت لگی ہوئی ہے اور اس لیے انگلستانی قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ تمام منفعت کے ذرائع پر ہمیشہ قابض رہے۔ انگلستان کے روپے سے یہاں ریلیں بنیں، تار کے سلسلے قائم کیے گئے، آسام میں چائے کی کاشتکاری کا اتنا بڑا عظیم الشان سامان کیا گیا جس کے مالک اینگلو انڈین احباب ہیں، بنگال اور بہار میں سفید رنگ کے مہربان نیل کی کاشت کرتے ہیں اور وہاں بھی انگلستان کا ہی روپیہ لگا ہوا ہے۔ ان حالات کے اندر ناشکر گزار اور احسان فراموش ہندوستانیوں والوں کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ ہمیں کسی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں جو ان کے حق اور فوق مہربانوں کو بوجہ امتیاز رنگ حاصل ہیں۔ لیکن یہاں پر یہ عرض کرنا منظور ہے کہ ذرا اس واقعہ کو حقیقت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے کہ کتنا بڑا فوری سرمایہ ہندوستان سے فوائد اور منافع کے لیے خود ہندوستان میں لگایا ہے۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی پہلے پہل ہندوستان میں بنگال اور دیگر مقامات پر قابض ہوئی تو اس وقت ہندوستان افلاس زدہ اور غربت رسیدہ ملک نہیں تھا، بلکہ یہاں سرمایہ کافی تھا اور دولت بھی اتنی تھی کہ جس سے ہم نے انگلستان کو مالا مال کر دیا۔ واٹ ہمیلٹن جو ایک غیر سرکاری مصنف ہیں ایسٹ انڈیا گزیٹر (سیکنڈ ایڈیشن مطبوعہ لندن 1828، جلد اول صفحہ 216) میں ہندوستان کی اس وقت کی حالت سے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

> "نواب [illegible] جعفر خاں عرف مرشد قلی خاں اور شجاع خاں کے عہد میں ملک کی حالت بہت عمدہ تھی اور جگہ جگہ ترقی و خوشحالی کے آثار نمایاں نظر آتے تھے۔ اور ٹیکس کی تکلیف بھی لوگ بہت کم محسوس کرتے تھے۔ چنانچہ ایک کروڑ روپیہ سالانہ سرکاری خزانے میں ملک کی مالگزاری سے داخل کیا جاتا تھا۔ علی وردی خاں کے عہد میں بھی زمینداروں کی حالت اتنی اچھی تھی کہ انھوں نے مرہٹوں سے مقابلہ کرنے کے لیے علی وردی خاں کو ایک مرتبہ ایک کروڑ روپیہ نذر دیا اور دوسری مرتبہ پچاس لاکھ روپیہ پیش کیا۔"

یہ تھی بنگال کی حالت جب انگلستانی تاجروں کی جماعت دہلی کے بادشاہوں کے تخت پر قابض ہوئی اور یہ شہادت جو اوپر پیش ہوئی کسی خوشامدی مسلمان مورخ کا بیان نہیں ہے بلکہ اس شخص کا بیان

ہے جو اینگلو انڈین گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔

کیا لطف جو غیر پردہ کھولے
جادو وہ جو سر چڑھ کے بولے

جب کلائیو 1757ء میں مرشد آباد میں داخل ہوا تو وہ اس کے متعلق لکھتا ہے:

"یہ شہر اتنا ہی وسیع آباد اور دولت مند ہے جتنا کہ لندن ہے۔ فرق مرشد آباد اور لندن میں یہ ہے کہ اول الذکر شہر میں دولت مند لوگ بہ نسبت مؤخر الذکر کے مقام کے زیادہ ہیں"۔

اوپر کے اقتباسات سے آپ کو معلوم ہوگا کہ انگریزوں نے ایک دولت مند ملک پر قبضہ کیا تھا نہ کہ ایک فقیر اور مفلس ملک پر جہاں اس کی ضرورت ہو کہ اس کی آبادی اور ترقی کے لیے اپنے ملک کی دولت لا کر صرف کی جائے۔

ہندوستانی جان کی قیمت

24 فروری کے "جمہور" میں وزیر آباد اسٹیشن پر ایک گورے سپاہی کے ہاتھوں ایک ہندوستانی کی جان جانے کا افسوسناک واقعہ درج کیا جا چکا ہے۔ اس وقت تک جو واقعات بیان کیے گئے تھے وہ اخبار "دیش" کی تازہ ترین رپورٹ کے مطابق بہت کچھ جداگانہ ہیں۔ اگر "دیش" کے رپورٹر کے بیان کردہ واقعات کو صحیح دیکھا جائے کہ سارجنٹ کی گولی سے ایک ہندوستانی کے قتل کو ایک مسلمان ڈپٹی مجسٹریٹ رفع دفع کرتا ہے اگرچہ وہ بعد میں دبا دیا جاتا ہے داستان اس سے کہیں زیادہ دردناک ہو جاتی ہے۔ دیش رقم طراز ہے:

"ایک شخص نواب خاں سفید پوش کا جرگولہ تحصیل وزیرآباد اس کمرہ میں داخل ہوا جس میں سارجنٹ مذکور بیٹھا ہوا تھا۔ سفید پوش تو دوسرے درجہ میں بیٹھ گیا اور اس نے اپنے نوکر کو جو ساتھ تھا اسی کمرہ میں بٹھا دیا جو نوکروں اور چپڑاسیوں کے لیے تھا۔ ابھی چند منٹ نہ گزرے تھے کہ گولی چلنے کی ایک خوفناک آواز پلیٹ فارم سے آئی اور فوراً یہ شور مچ گیا کہ ایک مسافر مار ڈالا گیا ہے۔ خاں صاحب

[illegible] یورپین [illegible] بھی اس گاڑی میں سفر کر رہے تھے
[illegible] تحقیقات پر معلوم ہوا کہ [illegible] کی بندوق سے جو گولی چلی تھی وہ
[illegible] کے تختوں سے نکل [illegible] سفید [illegible] چھید
[illegible] چھید [illegible] تختوں [illegible] اور پھر [illegible]
[illegible] گزر کر [illegible] گاڑی کے سامنے کر وہیں گری۔ یورپین
[illegible] عدالت میں مقدمہ دائر کیا گیا۔ نواب خاں سفید خاں صاحب
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] کسی اور چیز سے وہ
[illegible] بندوقیں تھیں اور ایک بندوق وہ ہاتھ میں لے
[illegible] کا بیان سننے کے بعد قرار دیا گیا کہ جو
[illegible]

[illegible] معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی [illegible] یورپین [illegible] شاید اس صورت میں بھی قیمت تصور کی جاتی [illegible] یورپین [illegible] اس کی صورت [illegible] ایک ہندوستانی ریلوے اسٹیشن کے [illegible] یورپین کو قتل قرار دے [illegible] عدالت میں مقدمہ [illegible] مقدمہ کی کارروائی دیکھتے ہوں۔ یورپین جان [illegible] سے زیادہ مدت تک جاری [illegible] ہندوستانی کی جان بھی [illegible] قیمتی ہوگئی [illegible] یورپین جان [illegible] ہندوستانی کی جان شاید دیگر ہندوستانیوں سے کچھ زیادہ قیمتی

کی جا سکتی ہے کیونکہ سفید پوش حضرات اسے بطور رنگروٹ بھرتی کرانے کے لیے لے جا رہے تھے۔ موجودہ صورت میں ہندوستانی جان کی قیمت یہ ٹھہری کہ سارجنٹ صاحب کچھ دیر تک ایک کمرہ میں زیر حراست رہے اس کے بعد عدالت تک جا کر رہا ہو گئے۔

"ہمدرد"

2 مارچ 1918ء

پریس ایکٹ (1)

2 مارچ وہ تاریخ ہے جس تاریخ کو گزشتہ سال آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن کا وفد ہز ایکسیلنسی وائسرائے کی خدمت میں باریاب ہوا تھا اور اس نے اپنے جائز معروضات کو پیش کرتے ہوئے استدعا کی تھی کہ پریس ایکٹ جو در اصل ایک آزاد حکومت کی شان کے منافی ہے منسوخ کیا جائے مگر اس وفد کو جس طرح کا جواب دیا گیا وہ پیش نظر ہو تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی [illegible] کوئی تاریخ میں کبھی کسی وائسرائے نے کسی وفد کو اس قدر سخت اور غیر ہمدردانہ جواب نہیں دیا جیسا کہ یہ ہمدردانہ جواب ہز ایکسیلنسی لارڈ چیمسفورڈ کی طرف سے آل انڈیا پریس ایسوسی ایشن کو دیا گیا۔

دنیا میں اخبار کی آزادی سب سے بڑی چیز ہے اور اخباروں کی قوت مسلم الثبوت امر ہے لیکن یہ قوت اس وقت اور اس طرح پیدا ہوتی ہے اس حالت میں اور اس وقت جبکہ اخبارات آزاد ہوں۔ انگلستان ایک آزاد ترین ملک کہا جاتا ہے اور وہاں اخبارات کو جو آزادی حاصل ہے اس پر بہت سے ممالک کے اخبارات رشک کرتے ہیں اور یہاں کی کیفیت یہ ہے کہ اخبارات حکومت کی تقویت کا باعث ہوتے ہیں۔ [illegible] انگلستان کا پریس کسی پارٹی کی حکومت کے خلاف ہو جائے تو اس پارٹی کی [illegible] حکومت نہیں رہتی۔ اخبارات حکومت کے [illegible] ہوتے ہیں۔ ان کی معروضات پر توجہ کی جاتی ہے اور ان کے مشوروں پر عمل کیا جاتا ہے۔ [illegible] مدبرین اخبارات کو سلطنت کا [illegible] ایک ضروری ستون تسلیم کرتے ہیں اور اب [illegible] ہندوستان کی [illegible] حکومت میں اس وقت [illegible] اصل میں اپنے [illegible] ان میں قانون [illegible] ایک قانون ہے۔

مذہبی کتب جن میں انجیل، قرآن کریم اور وید اور بعض دیگر مذاہب کی قابل احترام کتب شامل ہیں امن و امان وسیع النظری سے دیکھا جائے۔ جو وسیع النظری پریس ایکٹ کی بے پناہ انھوں نے اپنے لیے منتخب کر لی ہے اور پریس ایکٹ کا استعمال اسی غیر مدبرانہ طریقے سے ہوتا رہا جس طرح سے اس وقت تک ہوتا رہا ہے تو اس قانون کے دور رس ہونے کا اندیشہ غالباً غلط نہیں کہا جا سکتا کیونکہ ان کتب کے متعلق بھی ہر وقت حکومت کے خداوندوں کی طرف سے ممنوع اور قابل اعتراض ہونے کے احکام صادر ہو سکتے ہیں۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے لیے ہم مسلمان اخبار نویسوں کے سامنے ایسی نظیروں کی مثالیں موجود ہیں جنھیں وہ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ آج اس پریس ایکٹ کی بدولت کامریڈ اور ہمدرد پریس ختم ہو چکے ہیں۔ زمیندار پریس اسی کا شکار ہوا ہمدل پریس کی جائداد قانون کی بدولت ضبط ہوئی، مدینہ اور انقلاب فنا ہوا اور ان کے علاوہ بہت سی اور مثالیں ہمارے دامن میں ہیں گروہ دل اور وظائف کہاں سے ہیں جس سے ان سب داغوں پر جو مسلمانوں کے دلوں میں نمودار ہوئے ہیں ملمع پاشی کی جائے۔

ہماری نہایت حق سے یہ رائے ہے کہ تعزیرات ہند مجرموں کو سزا دینے کے لیے اور ملک میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے بہت کافی ہیں اگر وہ کافی نہیں تھیں اور پریس ایکٹ کے اجرا کی ضرورت محسوس ہوئی تھی تو وہ محض اس لیے نہیں تھی کہ ان اخباروں کو جو ملک میں امن و امان قائم رکھنا چاہتے ہیں اور اس غرض سے عمال حکومت کے احکام و قوانین کی نکتہ چینی کرتے ہیں، کی ضمانت کے تحت ضمانت دیے جانے پر مجبور کیے جائیں ان کی ضمانتیں ضبط ہوں ان کے پریس حکومت کے بیت المال میں داخل کیے جائیں۔ اگر پریس ایکٹ وضع ہوا تھا تو اس لیے کہ مجرمانہ سازشوں کو ترقی دینے والے اخبارات اور رسالے ضبط ہوں اور ان کے پریسوں سے ضمانتیں طلب کی جائیں اور اگر ضرورت ہو تو ان پریسوں کو ان کے جرم کی پاداش میں ضبط کیا جائے کہ وہ ملک کے امن و امان کو درہم برہم کرنے پر تلے ہوئے ہیں مگر اس میں بھی کافی احتیاط برتے جانے کے وعدے کیے گئے تھے وہ وعدے فراموش ہو گئے اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ وہ اخبارات جو ملک میں امن و امان اور حقیقی امن و امان قائم کرنا چاہتے تھے نذر اجل ہو گئے۔

ایک ہندوستانی اخبار کے ایڈیٹر کے سر پر پریس ایکٹ کی وہ تلوار لٹکی رہتی ہے جو نیک نیتی

سے نکتہ چینی کرنے پر بھی اس کی گردن کاٹ دیتی ہے قلم اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور وہ قلم جو آزادی حریت اور انصاف کی حمایت میں چلنے کے لیے ہوتا ہے مگر اس تلوار بے نیام کی بدولت اس کا ہاتھ حق کی حمایت انصاف کی طلب اور ظلم کی شکایت سے کانپتا ہے اور اس صورت میں وہ ہرگز وہ فرائض ادا نہیں کرسکتا جو اخبار نویس کی حیثیت سے اسے ادا کرنا چاہئیں۔

پریس ایکٹ پبلک آواز کو روکتا ہے پبلک کی آواز کو بند کرنے کی وجہ سے اندرونی سازشوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے بجائے اس کے کہ پھوڑے کا مواد بہنے دیا جاتا اس کو روکا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ خون کے اندر زہر پھیلنے لگا بنگال میں اگر لارڈ کرزن کی گورنمنٹ یہ سختیاں نہ کرتی تو کبھی انارکسٹ پیدا نہ ہوتے۔

"جمہور" 5 مارچ 1918ء

پریس ایکٹ (2)

جب لارڈ منٹو کی حکومت کا تیسرا سال شروع ہوا تو اس وقت ان کے خیالات بھی سول سروس کے اراکین کے خیالات سے متفق ہوگئے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ اس کی وجہ صحبت کا اثر تھا یا کچھ خارجی واقعات، بہرحال انھیں ضرورت محسوس ہوئی کہ پریس پر "بہت اقتدار" قائم کیا جائے اور آپ نے کہا "اخباروں کا مسودہ قانون کسی طرح بھی عام قانون مطابع کا قائم مقام نہیں ہے اور اس سے کسی طرح بھی ہمارے ہاتھ نہیں بندھ جاتے کہ ہم کوئی ایسا قانون بنائیں"۔ اپنی روانگی سے قبل 1910ء میں آپ نے اپنا خیال پورا کیا اور یہ کہہ کر کہ "میری رائے میں ہندوستانی پریس پر مزید قبضہ و اقتدار کی سخت ضرورت ہے۔" ایک مسودہ قانون امپیریل کونسل میں پیش کرایا۔

۴ فروری کی تاریخ ہندوستانی پریس کے لیے ایک حسرت ناک تاریخ ہے جس دن امپیریل کونسل کے اجلاس میں سر ہربرٹ ریزلی نے ایک ایسا مسودہ قانون پیش کیا جس نے ہندوستانی پریس کو زندہ درگور کردیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہ بل ۲۲ جنوری کو مکمل ہو چکا تھا اور ایس پی سنہا چونکہ اس مسودہ قانون کے خلاف تھے اس لیے انھوں نے استعفیٰ داخل کردیا تھا مگر پھر اس وجہ سے کہ وہ گورنمنٹ کی قوت کو کمزور کرنا نہیں چاہتے تھے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔

ہندوستانی پریس کی [illegible] پر [illegible] والا قانون پیش کرتے ہوئے سر ہربرٹ نے کہا مائی لارڈ میں یہ ایک مسودہ قانون پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں جس کے ذریعے سے ہندوستانی پریس پر مزید قبضہ کیا جا سکے دوسرے الفاظ میں جس کے معنی یہ ہیں کہ مقامی پریس انگریزی یا ہندوستانی دیسی زبانوں یا انگریزی زبان سے ان سب وجوہ کی بنا پر مباحثہ [illegible] تنقید ہی کے حدود میں رکھا جائے"۔

جب مقامی گورنمنٹ کو یہ محسوس ہو کہ کوئی پریس جس نے دفعہ 2 کی رو سے ضمانت داخل کی ہے کوئی خبر، کتاب وغیرہ چھاپنے کی غرض سے استعمال کیا جا رہا ہے جس میں ایسے جملے اور الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کا [illegible] مجلس کی حکومت سے خوف، نفرت و حقارت پیدا کرنے والا ہو یا ملک معظم کی رعایا کے کسی طبقہ یا کسی طبقے کے خلاف [illegible] پیدا کرنے کی طرف ہو تو اس صورت میں مقامی گورنمنٹ ایسے پریس والے [illegible] اس کی ضمانت ضبط کر سکتی ہے اور اخبارات [illegible] ضبط کیے جانے کا حکم دے سکتی ہے۔

[illegible] قبضہ [illegible] کی غرض سے قانون پاس ہوتا ہے۔ ہندوستانی ممبران کونسل میں [illegible] قانون کا جو مقصد [illegible] یہاں [illegible] تحریک کی تائید میں رائیں دیتے ہیں۔ ابتداء میں پریس ایکٹ کا [illegible] پریس ایکٹ کا [illegible] ہندوستانی اخبارات [illegible] کی نیت [illegible] حکومت نے شروع کر دیا کہ ان وعدوں کے خلاف عمل ہوتا ہے۔

یاں لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب میں
واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں

[illegible] اقتدار [illegible] بلبل کی آواز [illegible] سکتی ہے [illegible] پر نظر نہیں کرتی [illegible] آواز نہیں دیکھتی اور [illegible] میں شامل ہے۔

[illegible] قانون [illegible]

کے ہاتھوں میں ایک ایسا حربہ ہے جس کی داد فریاد کے لیے کوئی دنیاوی عدالت کھلی ہوئی نہیں ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جب حکومتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اب ملک میں بدامنی زیادہ پھیل گئی ہے اور لوگ کسی طرح بھی قابو میں نہیں آسکتے تو اس وقت ایک قانون نافذ کیا جاتا ہے جس کو فوجی قانون کہتے ہیں اور ہمارے الفاظ میں اس قانون کی تعریف یہ ہے کہ کسی قانون ہی پر عمل نہ کیا جائے۔ اسی طرح حکومتیں جب یہ سمجھتی ہیں کہ اب قلم کی حرکتیں بے جا ہونے لگی ہیں اور لوگ ہندوستان کی روشنی اور قلم کی نوک سے خواب غفلت سے بیدار ہوتے ہیں تو قلم اور اہل قلم کے لیے بھی فوجی قانون نافذ کیا جاتا ہے جس کے مختلف نام ہوا کرتے ہیں۔ ہندوستان میں نہ تو بدامنی ہے اور نہ قلم کی حرکتیں اس قدر مضرت رساں ہے مگر ہندوستان میں ایک قانون رائج ہے جس کا نام ہے "پریس ایکٹ"۔

ہندوستان ایک غریب ملک ہے لوگ فاقہ کے مہیب اور خوفناک دیو کے پنجے میں گرفتار ہیں۔ ہمارے ملک کا بڑے سے بڑا دولت مند بھی یورپ کے ممالک کے معمولی تاجر سے بھی بدتر ہے اور اس کے علاوہ ہندوستان سے کسی جتھہ کا فرد ہو تو مشہور ہے کہ دنیا ہندوستان کی غربت کے حال سے واقف ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی پریس ایکٹ کی ناگزیر واقعہ ضمانت کی رقم ہے جس کو ادا کرنا ناچیز اور اس سے ہندوستان کے محقق ترین کے دماغ مدعا ہوں اور ان کی رپورٹ ذرا بھی مخالف ہو تو سب چیز بے شک اور فاقہ مست اہل قلم ہزار پانچ سو روپیہ کی رقم سے ... رقم کی خطیر رقم پیش کرنی پڑتی ہے۔ ہزاروں مصائب اور مشکلات ... ہندوستان کا مفلس اخبار نویس پیدا کرتا ہے اور اس سے ہندوستان ... ذہن میں آتی ہے ... انعقاد ہوتے ہیں ... کسی ضمانت اور ... کا حکم نہیں ہے اور شب کو جب وہ اپنے بستر پر لیٹتا ہے تو اس خوف اور بے چینی سے کروٹیں بدلتا ہے کہ کل کہیں ضمانت کی رقم ضبط نہ ہو جائے اور اس طرح وہ دن رات ہمیشہ اسی دغدغہ اور تردد کے اندر گزارتا ہے۔

پریس ایکٹ نے ہندوستان کی علمی ترقی اور قلمی ارتقاء کو اس طرح روک رکھا ہے کہ ہندوستان میں کسی طرح کی علمی نشوونما ناممکن ہے جب تک کہ یہ ایکٹ ایک دم اٹھا نہ دیا جائے۔

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ گورنمنٹ آگے بڑھے اور ہمارے اس جائز اور صحیح مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کرے۔ آج ہم بھی یورپ کی طرح آزادیٔ قلم و حریت خیال کے طالب ہیں۔ جو لوگ ہم پر حاکم ہیں وہ ایک منٹ کے لیے بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتے کہ ان کے ملکوں میں ایسا قانون نافذ ہو کہ جس پر عدالت عدل کا اختیار نہ ہو۔

''جمہور'' 6 مارچ 1918ء

مولانا حسرت موہانی اور کلکٹر میرٹھ

جس دن مولانا حسرت موہانی کی میعاد قید ختم ہوئی اسی دن پہلے اس سے کہ مولانا جیل خانہ کی حدود سے باہر آجائیں، ان کو احکام نظر بندی سنا دیے گئے۔ مولانا ممدوح نے احکام لینے سے انکار کر دیا اور صرف اس وقت تک کے لیے جب تک کہ آپ کے میموریل کا جواب ملے بطور خود ضلع میرٹھ میں ایک مقام پر رہنا منظور کیا۔ مجھ سے میرٹھ کے مسلمانوں نے شکایت کی کہ ''جمہور'' نے مولانا حسرت موہانی کے متعلق ان کے طرز عمل پر غیر منصفانہ نکتہ چینی کی۔ وہ اگر حسرت کا استقبال نہ کر سکے تو اس کا باعث ان کی غفلت اور بے حسی نہ تھا بلکہ ایسی حالت میں جب کہ کوچہ و بازار میں ہر طرف پولیس کا سخت پہرہ بٹھا دیا گیا تھا اور اس طرح سرکاری تیاریاں کی گئی تھیں کہ گویا میرٹھ میں حسرت کا پہلا قدم بغاوت کی آگ لگا دے گا، جب کہ خود نواب اسحاق خاں صاحب کا موٹر راستہ میں روک لیا گیا اور بہ مشکل ان کو جیل خانہ کے دروازے تک پہنچنے کی اجازت دی گئی۔ مسلمانان میرٹھ کی طرف سے حسرت کا استقبال نہ کیا جانا ان کی بے حسی پر محمول نہیں کیا جا سکتا

حسرت کی مالی مشکلات کا مجھے بہت کافی علم تھا اور میعاد قید ختم ہوتے ہی میں نے ان سے ملنے کا قصد کیا تا کہ ان کی مشکلات کے متعلق ان سے گفتگو کر کے بعض ضروری امور طے کر لوں۔ کلکٹر صاحب میرٹھ نے میرے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا اس کی تفصیل اس خط سے ظاہر ہوگی جس کی نقل آج کی اشاعت میں درج کی جاتی ہے۔ یہ خط درحقیقت خلاصہ ہے ان تمام خط و کتابت کا جو مجھ سے اور کلکٹر میرٹھ سے ہوئی۔ ان کا غیر معقول طرز عمل ایک ادنیٰ نمونہ ہے اس حاکمانہ اقتدار پسندی کا جو ہندوستان میں سول سروس کا تمغۂ امتیاز ہے۔ یہ قاہرانہ اور جابرانہ طرز عمل ہر قدم پر ہم کو یاد دلاتا ہے کہ ملک معظم کی ہندوستانی رعایا کو سول سروس نے کس طرح

ٹھکرا ٹھکرا کر غلام بنایا ہے، ہماری زندگی کے یہ معمولی واقعات ہیں جو ہر خوددار ہندوستانی کے دل پر اپنا نقش چھوڑ جاتے ہیں اور یہ نقش وہ ہیں جن کو ریفارم اسکیم کا اچھے سے اچھا کھلونا بھی نہیں مٹا سکتا۔ کلکٹر میرٹھ کو اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ سلطنت برطانیہ کو بنگال کے انارکسٹ کا بم ہرگز وہ نقصان نہیں پہنچا سکتا جو ان کے ہم خیال حکام کا غیر دانشمندانہ غرور حکومت پہنچا سکتا ہے۔ کلکٹر میرٹھ کے نام اپنے آخری خط کی نقل ہدیہ ناظرین کرتا ہوں

بخدمت مجسٹریٹ صاحب ضلع میرٹھ

جناب من! آپ کا دو جولائی کا خط مجھے ملا، جس میں آپ نے مجھے مولانا حسرت موہانی سے ملنے کی اجازت دینے سے قطعی انکار کیا ہے، سچ تو یہ ہے کہ مجھے آپ کے اس طرز عمل پر ذرا بھی تعجب نہیں ہوا، میں حکام کے مزاج سے ایک گونہ واقفیت رکھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ بحث مباحثہ بیکار ہے، میں آخری دفعہ یہ خط صرف اسی لیے لکھ رہا ہوں کہ میں وہ صورت آپ کو بھی بتا دوں جس صورت میں یہ معاملہ اخبارات میں شائع ہوگا، میں آپ کے کسی جواب کا منتظر نہیں ہوں اور جانتا ہوں کہ مزید خط و کتابت فضول ہے۔ قانون تحفظ ہند کے ہوتے ہوئے کوئی شخص مجسٹریٹ کے اس اختیار تمیز کے متعلق جو اکثر ہماری قسمتوں کا فیصلہ کرتا ہے اور رواداری جائز نہیں رکھتا، چوں و چرا نہیں کر سکتا۔

میں دیکھتا ہوں کہ آپ کا دفتر اس کی بھی پروا نہیں کرتا کہ میرا نام تمیز کے ساتھ لکھے شاید ایک معمولی اخبار نویس (جو ایک نہایت مشتبہ مخلوق ہے) کے نام کے ساتھ مسٹر یا اسکوائر کا لکھنا بھی حاکمانہ شان کے منافی سمجھا گیا، بہر حال مجھے کوئی شکایت نہیں میں جانتا ہوں کہ سلطنت برطانیہ میں میرا مرتبہ ایسا نہیں کہ مجھے شکایت کرنے کا کوئی حق حاصل ہو۔

ذیل میں چند واقعات درج کرتا ہوں، جو اس خط و کتابت سے لیے گئے ہیں جو میرے آپ کے درمیان ہوئی۔

(1) ۹ جون کو میں نے آپ کو خط لکھا جس میں حسرت موہانی سے ملنے کی اجازت چاہی تھی اس خط میں میں نے لکھ دیا تھا کہ میں ان کی مالی اور تجارتی مشکلات کے متعلق ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ میں نے یہ بھی لکھا کہ:

"باوجودیکہ میں جانتا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ وہ (حسرت موہانی) نظر بند نہیں ہیں تاہم میں نے مناسب یہی سمجھا کہ آپ سے اجازت لے لوں"۔

جب [illegible] جون تک جواب نہیں آیا تو میں نے آپ کو جوابی تار دیا پھر بھی [illegible] جون تک کوئی توجہ نہیں دی گئی اور پھر اس تاریخ کو میں نے ایک خط لکھا جس میں میں نے آپ کو بتایا کہ

"میں لکھنؤ سے صرف اس لیے آیا ہوں تاکہ مولانا حسرت سے ملاقات کر سکوں۔ اس قدر طویل فاصلہ طے کرنے کے بعد اس طرح سے واپس [illegible] جانا میرے لیے نہایت غیر خوشگوار ہے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کو ایسے اختیارات تمیزی حاصل ہیں جو آپ کو بالکل خود مختار بنا دیتے ہیں اور اسی لیے آپ [illegible] بغیر مجھے اجازت دینے سے انکار کر سکتے ہیں۔ ہندوستان میں صورت حالات یہی ہے اور ہم کو ایسی ہی حالات میں زندگی بسر کرنی پڑتی ہے۔ تاہم یہ امید تو بیجا نہ تھی کہ جو چٹھی [illegible] جواب تو ضرور دیا جائے گا [illegible] خط [illegible] گیا ہے۔ اس کو دیکھتے ہوئے میں اس [illegible] نہیں رکھتا ہوں [illegible] حسرت موہانی سے مل سکوں یا نہ مل سکوں مگر میں آپ سے جواب ضرور حاصل کرنا چاہتا ہوں تاکہ مجھے معلوم ہو سکے کہ آپ کا نقطہ نظر کیا ہے؟"

(2) 2؍جون کو آپ نے میرے خط اور تار کا جواب دیا اس میں آپ نے لکھا کہ میرا خط [illegible] تاریخ کو آپ کی نظر سے گزرا [illegible] اس دن آپ نے دفتر کو ہدایت کی کہ مجھے [illegible] دی جائے [illegible] نہیں دی جا سکتی۔ [illegible] آپ لکھتے ہیں کہ

"مجھے معلوم ہوا ہے [illegible] دفتر نے [illegible] 21 تاریخ تک نہیں دی"۔

[illegible] میں نے [illegible] 21 جون کو ایک خط لکھا جس میں میں نے [illegible] دریافت کی تھی میں نے اس خط میں لکھا تھا۔

مجھے [illegible] آپ [illegible] بات [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

بکل ہی غلط چھپی ہے۔ جو برتاؤ آپ نے میرے ساتھ کیا ہے وہ میرے لیے ذرا بھی قابل تعجب نہیں۔ مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ ... آپ نے ... اور ... اشخاص کو جیسے کہ ... نظر بندان ... اعانت نظر بندان کلکتہ ہیں، مولانا حسرت سے ملنے کی اجازت نہیں دی۔ مولانا حسرت کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کیوں کیا جاتا ہے یہ ایک سوال ہے جو انصاف اور عدالت کے واسطے سے حکام اعلیٰ سے کیا جائے گا"۔

اس خط کے جواب میں آپ نے 26 تاریخ کو لکھا کہ

"میں نے آپ کی درخواست منظور نہ کرنے کا ذاتی طور پر میں آپ سے واقف نہ تھا اور آپ نے اپنے خط میں جو بیان کیا تھا اس کی تصدیق کسی افسر ... یا کسی ذمہ دار شخص سے نہیں کی تھی"۔

(3) 28 جون کو اس خط کا جواب میں نے لکھا اور اس میں آپ کو بتایا کہ اجازت سے انکار کرنے سے پہلے آپ نے مجھ سے یہ "تصدیق" نہیں طلب کی۔ میں نے کہا:

"چونکہ میں صوبہ جات متحدہ میں نہیں رہتا اس لیے ممکن ہے کہ ذاتی طور پر میرے نام سے زیادہ لوگ واقف نہ ہوں تاہم حیثیت ... غلط ہے میرا نام اس صوبہ میں اچھی طرح ... ہے اور ... اشخاص ہیں جو ذاتی طور پر واقف ہیں اور ان سے اگر دریافت کیا جاتا تو وہ میرے بیان کی تصدیق کرتے"۔

میں نے آپ کو حسب ذیل چار اصحاب کے نام لکھے جن کو میں ایک مجسٹریٹ سے کم کے ذمہ دار اور معزز نہیں سمجھتا۔

(1) نواب محمد اسحاق خاں، ریٹائرڈ جج

(2) مسٹر اسمٰعیل خاں بیرسٹرایٹ لا

(3) قاضی نجم الدین صاحب

(4) مسٹر قاضی بشیر الدین صاحب (بی۔ اے، ایل ایل بی۔ وکیل اور شیعہ قومی ... مولانا حسرت موہانی)۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے خط مرقومہ 29 تاریخ میں آپ کے یہ الفاظ کہ "کوئی افسر گورنمنٹ یا ذمہ دار شخص صاف بتاتے ہیں کہ آپ کا منشا کیا ہے اس سے مجھے تعجب ہوا کہ وہ نام جو میں نے لکھے تھے آپ کو تسکین نہ دے سکے دراں حالیکہ جس شخص کو بھی ان ناموں کا حوالہ دیا جاتا اس کو تسکین ہو جاتی تو وہ نواب اسحاق خاں اور مسٹر اسمٰعیل خاں جیسے لوگ آپ کے نزدیک کافی لائق عزت ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اول تو آپ بغیر کسی وجہ بتائے میری درخواست میں جو بھی تشریح و تاویل کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں تمہاری درخواست اس لیے رد کرتا ہوں کہ اس درخواست میں جو کچھ لکھا گیا تھا اس کی تصدیق کے لیے کسی افسر کی گواہی کی ضرورت تھی۔ اس میں کسی شخص کا حوالہ نہیں دیا گیا تھا میں فوراً ان شرائط کی تعمیل کرنے کو تیار ہوں، انہوں نے ایک مشہور معزز اور ذمہ دار اشخاص کے نام آپ کو بتائے جن کا ہر لفظ قابل تعریف ہے جو کسی حیثیت کا ہر لفظ رکھتا ہوگا۔ پھر آپ نے میرے بیانات کی تصدیق نہ کر کے یقین میں نے [illegible] تمام معقول معروضات اور منطق [illegible] طاق رکھ دیا [illegible] کے خلاف (باوجودیکہ میں نے آپ کے شرائط کی تعمیل کر دی تھی) میری درخواست نامنظور کر دی۔ آپ کی اس کارروائی کو نہایت غیر مستحسن خود سرانہ کہا جائے تو بجا ہے۔ اس لیے کہ شروع میں میرا طرز عمل نہایت معقول رہا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ [illegible] حسرت موہانی نظر بند نہیں ہیں اور کسی کا دل چاہے ان سے بلا اجازت مل سکتا ہے۔ تاہم اخلاقاً میں نے آپ کو خط لکھا لیکن میرے اس اخلاق کا معاوضہ مجھے یہ دیا گیا کہ آپ نے میری معروضات کے متعلق یہ طرز عمل اختیار کیا کہ جس کو آپ ہرگز جائز ثابت نہیں کر سکتے سوائے اس کے کہ قانون تحفظ ہند کے الفاظ استعمال کریں یعنی چونکہ [illegible] وغیرہ وغیرہ

جیسا کہ میں نے [illegible] تاریخ کے خط میں لکھا تھا مسٹر حسرت موہانی جو ایک شخص برداشت کر سکتے ہیں [illegible] اور میں جانتا ہوں کہ وہ اس تکلیف کی پرواہ نہ کریں گے۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں کی پرواہ نہیں کر سکتے کیوں کہ وہ ان چیزوں سے بالاتر ہیں اور اب میں پھر کہتا ہوں کہ [illegible] محسوسات [illegible] اور روحانی حقیقت [illegible]

حقوق اور اپنی عزت کی حفاظت خود کرنا سیکھ رہی ہے۔

(دستخط) عبدالغفار

ایڈیٹر جمہور

جمہور

11/اگست 1918ء

ہندوستانیوں نے جب انگریزوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ کیا اور "ہوم رول" کی مانگ تیز ہونے لگی تو لندن ٹائمز میں ایک رپورٹ شائع ہوئی جس میں اس مطالبے کا مذاق اڑایا گیا تھا اور کہا گیا تھا کہ ہندوستانیوں کو ہوم رول کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے تو پھر وہ اس کا مطالبہ کیوں کر رہے ہیں۔ اس کے جواب میں قاضی عبدالغفار نے اپنے ایک اداریے میں لکھا

> "ٹائمز کہتا ہے کہ ہندوستان کے سیاست داں ابھی یہ نہیں جانتے کہ ہوم رول ہے کیا؟" اگر اس کی نگاہ میں تاریخ کوئی وقعت رکھتی ہے تو ہم عرض کریں گے کہ جب انگلستان کو ہوم رول حاصل ہوا تھا تو وہ بھی نہیں جانتا تھا کہ ہوم رول کیا ہے۔ جب ریاستہائے متحدہ امریکہ نے آزادی کا علم بلند کیا تھا تو وہ بھی ہوم رول کی حقیقت سے بے خبر تھیں۔ جب برطانیہ کی نوآبادیوں نے اپنی حکومت کی بنیادیں قائم کی تھیں تو ان کے دماغ بھی ہوم رول کی صحیح تصویر سے نا آشنا تھے۔ فطرت انسانی کے لیے قدرت نے چند بنیادی اصول قائم کر دیے ہیں۔ ان ہی میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ جب تک دو مختلف چیزیں مقابلے میں نہ رکھی جائیں انسان کی قوت امتیازی ان کے فرق کو محسوس نہیں کر سکتی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ناممکن تھا کہ انسان سپید و سیاہ میں تمیز کر سکتا۔ ہم ہندوستانی بھی اسی لیے ہوم رول مانگ رہے ہیں۔

زبردستیاں اور پردہ داریاں

امپیریل کونسل میں ہندوستانی نظربندوں کے نام اور مقام نظربندی کے سوال پر سرکاری ممبر نے جواب دیا تھا کہ گورنمنٹ ہند کی رائے میں یہ کافی ہے کہ نظربندوں کے اعزا کو ان کے

متعلق عمارت ان کے نام اور دیگر تفصیلات عام طور پر مشتہر کرنا مفاد عامہ کے لیے مناسب نہ ہوگا۔ اس پر قاضی صاحب نے ایک اداریے میں زبردست طنز کرتے ہوئے ''زبردستیاں اور پردہ دریاں'' کے عنوان سے لکھا:

''اس شدید احتیاط کا کیا ٹھکانہ ہے کہ وہ نظر بندوں کے نام بھی نہیں بتانا چاہتے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم کیوں بتائیں کتنے بے گناہوں کو قانون تحفظ ہند کی آڑ میں گرفتار کیا ہے۔ ہم کیوں بتائیں کہ ہم نے کتنے بے قصوروں کو ان کے وطن اور عزیزوں سے چھڑا کر خانماں برباد کیا ہے۔ ہم کیوں بتائیں کہ ہم نے کتنے شوہروں کو ان کی بیویوں سے، کتنے بچوں کو ان کے ماں باپ سے، کتنے بھائیوں کو ان کی بہنوں سے جدا کر دیا۔ ہم کیوں بتائیں کہ ہم قانون تحفظ ہند سے کام لیتے ہیں یا کر چکے ہیں ... اب اگلا سا زمانہ نہیں۔ اگر حکومت کہے کہ فلاں چیز ''مفاد عامہ'' کے خلاف ہے تو مان لو کہ وہ ضرور خلاف ہے محض اس لیے کہ یہاں حکومت کے کلید بردار ایسا ہی فرماتے ہیں۔''

قاضی عبدالغفار چونکہ ایک ادیب بھی تھے اس لیے ان کی تحریروں میں زبان و بیان کا حسن بھی ہے اور طنز کی آمیزش بھی ہے۔ یہ اخبار محض ایک سال ہی نکل سکا لیکن اس نے اپنے اسلوب سے یہاں صحافت کو متاثر کر دیا تھا۔ اخبار جمہور نے صحافت میں ادب کی چاشنی پیدا کرنے کے لیے جو نمونہ پیش کیا۔ اگرچہ اس اخبار کی اشاعت کا وقفہ زیادہ نہیں رہا لیکن اس کی خدمات کو کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

صحافت اور تاریخ نویسی

جس طرح متعدد اصناف کے حوالے سے مفکرین و ماہرین کے اقوال موجود ہیں اسی طرح صحافت سے متعلق بھی کچھ اقوال پائے جاتے ہیں۔ یہ اقوال سنجیدہ بھی ہیں اور ظریفانہ بھی۔ حقائق کے قریب تر بھی ہیں اور حقائق سے پرے بھی۔ پسندیدہ بھی ہیں اور ناپسندیدہ بھی۔ دنیا میں جب سے اخبار نویسی کا آغاز ہوا ہے اسی وقت سے اس کے بارے میں دانشوروں کی رائیں بھی سامنے آتی رہی ہیں۔ صحافت کے حوالے سے سب سے معروف قول Matthew Arnold کا ہے۔ ان کا کہنا ہے "صحافت عجلت میں لکھا گیا ادب ہے"۔ اس کے علاوہ جو دیگر اقوال مشہور ہیں وہ کچھ یوں ہیں "ادب وہ فن تحریر ہے جو دوبارہ پڑھا جا سکتا ہے مگر صحافت صرف ایک بار" (Cyril Connolly) "ہزاروں سنگینوں کے مقابلے میں مخالف تین اخباروں سے ڈرنا چاہیے" (Napoleon) "بری خبر ہی اصل خبر ہے" (Marshal Mcluhan) "صحافت ناقابل مطالعہ ہے اور ادب پڑھا ہی نہیں گیا" (Oscar Wilde) "اور ایڈیٹر کا کام گیہوں اور بھوسی الگ کرنا اور بھوسی کی اشاعت کو یقینی بنانا ہے" (Elbert Hubbard) بعض اقوال ایسے بھی ہیں "نو نیوز از گڈ نیوز" یعنی کوئی خبر نہ ہونا اچھی خبر ہے۔ "کچھ نہ پڑھنے والا صرف اخبار پڑھنے والے سے کہیں بہتر تعلیم یافتہ ہے۔ اگر آپ اخبار نہیں پڑھتے تو Well Informed ہیں اور اگر پڑھتے ہیں تو Misinformed ہیں۔ اخبار نویسی کے حوالے سے عالمی واقعات کا تعین سیکنڈ ہینڈ ہسٹری کے وقت بتانے کے مترادف ہے۔ "کتا آدمی کو کاٹے تو خبر نہیں ہے مگر آدمی کتے کو کاٹ لے تو خبر ہے۔ کامیاب صحافت کا راز قارئین کو مشتعل کرنے میں ہے۔ صحافت چپ نہیں رہ سکتی، یہ اس کی عظیم خوبی بھی ہے اور خامی بھی اور صحافت ایک منظم گپ شپ ہے۔ چند اقوال تضحیک آمیز بھی

ہیں۔ ان کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ جیسے صحافی کتوں کی مانند ہیں کہ جب بھی کوئی چیز حرکت کرتی ہے وہ بھونکنے لگتے ہیں۔ صحافی الفاظ کے ساتھ صرف جیتے ہی نہیں ہیں بلکہ بعض اوقات انھیں کھاتے بھی ہیں۔ (یعنی وہ اپنی ہی رپورٹ یا اسٹوری کو پلٹ دیتے ہیں یا تردید کر دیتے ہیں۔) ہندوستانی اور اردو کے تناظر میں دیکھیں تو اکبر الہ آبادی کا یہ شعر زبان زد خاص وعام ہے کھینچو نہ کمانوں کو نہ تلوار نکالو، جب توپ مقابل ہو تو اخبار نکالو۔ بہرحال یہ سلسلہ کافی طویل ہے اور اس سے صحافت سے متعلق دانشورین و مفکرین کیا سوچتے ہیں اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

لیکن میں یہاں جس قول پر تھوڑا غور و خیال کرنے کی جسارت کروں گا وہ ہے 'صحافت تاریخ کی خام مسودہ سازی ہے۔ یعنی صحافت تاریخ نویسی بھی ہے۔ یہ قول امریکی اخبار واشنگٹن پوسٹ کے پبلشر اور مالک Filip Graham کا ہے۔ اس سے ملتی جلتی کچھ اور آراء بھی ہیں۔ جیسے صحافت دراصل ایک بھاگتی دوڑتی یا تیز رفتار تاریخ ہے اور صحافت محض تاریخ کی ابتدائی مسودہ سازی ہے۔ جب فلپ گراہم نے اپنے ایک لیکچر میں کہا کہ صحافت تاریخ کی خام یا ناہموار مسودہ سازی ہے تو اس قول کو کافی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن کیا معاملہ صرف یہیں تک محدود ہے یا صحافت اس سے بھی آگے کی کوئی چیز ہے۔ اس سوال کا جائزہ بھی امریکہ ہی کی ایک یونیورسٹی میں لیا گیا اور اس موضوع پر تحقیق کی گئی اور اس نتیجے پر پہنچا گیا کہ صحافت صرف ناہموار یا خام تاریخ سازی ہی نہیں کرتی بلکہ وہ اس سے پرے بھی عمل دخل رکھتی ہے۔ صحافت تاریخ نویسی پر قابل قدر انداز میں اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ یونیورسٹی آف میسوری ریسرچ نے اس مطالعے میں امریکہ میں انیسویں صدی میں صحافیوں کے ذریعہ تاریخی حوالوں کے استعمال کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس تعلق سے اخبارات میں شائع ایک خبر میں بتایا گیا ہے کہ جس دور کو بنیاد بنا کر یہ تحقیق کی گئی اس دور میں امریکہ میں تاریخی ریکارڈ شائع ہی نہیں ہوتے تھے یا ہوتے تھے تو بہت کم۔ مذکورہ یونیورسٹی میں صحافت کے پروفیسر Betty Winfield نے، جنھوں نے یہ تحقیق کی، یہ دعویٰ کیا ہے کہ صحافیوں نے پروفیشنل یا پیشہ ور تاریخ دانوں سے پہلے سے ہی قومی تاریخ کی اشاعت میں اہم رول ادا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس تحقیق کا عنوان تھا The Continuous Past Historical Refrents In 19th Century In American Journalism۔ بعد میں یہ تحقیقی مقالہ جرنلزم

اینڈ میونی کیشن مونوگراف میں شائع ہوا۔ اس ریسرچ کے دوران دو ہزار اخبارات و رسائل کی رپورٹوں کو بنیاد بنایا گیا تھا۔

صرف خبر نگاری ہی نہیں

اگر ہم مطالعے و مشاہدے کے گہرے سمندر میں اتر کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ دراصل صحافی صرف خبر نگاری ہی نہیں کرتا بلکہ وہ غیر محسوس طریقے سے قومی تاریخ کے بنیادی خدوخال کے نقوش ابھارنے کا فریضہ بھی انجام دیتا ہے اور انہی دستیاب نقوش کی مدد سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے یا ان پر چلتے ہوئے ایک مورخ اپنے کام کو آگے بڑھاتا ہے۔ ایک صحافی اجتماعی یادداشتوں کے سرچشموں سے برآمد ہونے والے حقائق کو حوالے کے طور پر اپناتا ہے اور پھر وہی حوالے آگے چل کر تاریخ سازی کے عمل میں کسی نہ کسی حد تک بنیاد فراہم کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ روزانہ اخبار کی عمر محض چند گھنٹوں کی یا ایک دن کی ہوتی ہے، چند روز بعد یا اگلے روز اخبار بھی باسی ہو جاتا ہے اور خبر بھی پرانی ہو جاتی ہے۔ یہ رائے کسی حد تک تو درست ہو سکتی ہے لیکن مکمل طور پر نہیں۔ کیونکہ اخبارات میں صرف خبریں ہی نہیں ہوتیں بلکہ اس دور کے سیاسی و معاشرتی نشیب و فراز کی جھلکیاں بھی ہوتی ہیں۔ اس میں اقتصادی و معاشی حالات کا بیان بھی ہوتا ہے۔ عوامی قدروں پر پرچھائیاں بھی نظر آتی ہیں۔ مختلف فنون پر اظہار خیال اور ان سے متعلق عصری رجحانات کی عکاسی بھی ہوتی ہے اور فنون لطیفہ کی ارتقائی منازل کا بیانیہ بھی قلمبند ہوتا ہے۔ ماضی کے واقعات و معاملات کا عکس بھی ہوتا ہے اور مستقبل کے سیاسی ڈھانچے اور معاشرتی رنگ و روپ کا پرتو بھی دکھائی دیتا ہے۔ طبقاتی ہم آہنگی اور کشمکش بھی نظر آتی ہے اور فرقہ وارانہ اتحاد و اختلاف کے مناظر بھی ابھرتے ہیں۔ ثقافتی میل ملاپ کی جلوہ سامانی بھی ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ثقافتی دہشت گردی کے خنجر سے اس میل ملاپ کو لہولہان ہوتے ہوئے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ حکومتوں کی قیادت میں چلنے والی فلاحی اسکیموں کی تفصیلات بھی ہوتی ہیں اور سرکاری و غیر سرکاری قوتوں کے زیر سرپرستی نسل کشی کے بھیانک مناظر بھی دکھائی دیتے ہیں۔ قومی اتھل پتھل، سیاسی اٹھک پٹک، عدالتی احکام و فیصلوں پر بھاری پڑنے والے سیاسی تغیرات کی

داستانیں بھی ہوتی ہیں اور سماجی سطح پر رونما ہونے والی تبدیلیوں کی ترجمانی بھی ہوتی ہے۔

کوئی بھی اخبار نویس یا رپورٹر خبروں کے حوالے سے صرف واقعات نگاری ہی نہیں کرتا بلکہ عوامی اذہان کی پرتوں کو بے نقاب بھی کرتا ہے اور ان پرتوں کی تہوں میں پوشیدہ افکار و خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر صورت گری بھی کرتا ہے۔ جب مضمون نگار کسی اہم واقعے پر قلم اٹھاتا ہے تو عصری تقاضوں کو تو ملحوظ خاطر رکھتا ہی ہے اس واقعے کی تہہ میں پوشیدہ اسرار و رموز کی گرہیں بھی کھولتا ہے۔ مثال کے طور پر کوئی اہل اور باصلاحیت مضمون نویس یا کالم نگار جب کسی حکومت کے معزول ہونے اور نئی حکومت کے تشکیل پذیر ہونے کے عمل کو قلمبند کرتا ہے تو وہ صرف یہی ایک کام نہیں کرتا بلکہ اس کا قلم اپنے ساتھ قارئین کو ماضی، حال اور مستقبل کی سیر بھی کراتا ہے اور سابقہ حکومت کی اچھائیوں اور برائیوں، حسن و قبح اور کامیابیوں و ناکامیوں کی رپورٹنگ کرنے کے ساتھ ساتھ نو تشکیل شدہ حکومت سے وابستہ عوامی توقعات کا تجزیہ بھی کرتا ہے اور حکومت کے ارباب بست و کشاد کے سامنے ایک لائحہ عمل بھی رکھتا ہے۔ یہ لائحہ عمل وقتی اور عارضی خواہشوں اور امنگوں سے تحریر نہیں ہوتا بلکہ اس کی تہہ میں طویل تجربات اور گہرے مشاہدات کارفرما ہوتے ہیں۔ اس سے ماضی کا منظر نامہ اور پیش منظر کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے اور عصری تقاضوں کے حدود و قیود کو بھی فراموش نہیں کیا جاتا۔ ایک کامیاب صحافی اور مدیر وہی ہوتا ہے جو اپنی چشم بینا کو ماضی پر مرکوز رکھے حال کے سمندر کی غواصی کرتا ہے اور مستقبل کے موتی تلاشنے میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔ جس صحافی کے اندر ایسی فنکارانہ صلاحیت ہوتی ہے اس کے نوک قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عوامی ذہنوں پر گہرے اثرات مرتسم کرتا ہے اور مستقبل کے لیے نقش راہ بھی متعین کرتا جاتا ہے۔ یہی نقش راہ تاریخ و ادب کے سفر پر گامزن ایک مورخ کے لیے قیمتی اثاثہ ثابت ہوتا ہے۔

یہ سچ ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ایک صحافی کے سینے میں بھی ایک ایسا دل دھڑکتا ہے جو سچائی کی جیت پر خوش اور اس کی شکست پر رنجیدہ ہو جاتا ہے۔ اس دل کے کسی نہ کسی گوشے میں ایک ادیب کی بھی دھڑکنیں موجود ہوتی ہیں اور جب ادب نواز ذہن اور انصاف پسند سوچ کا اتصال ہوتا ہے تو اخبار کے صفحے پر ادبی شہ پارے جنم لیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی جب یہ صحافی کا قلم ایک دوسرے میں مدغم سچ اور جھوٹ کے تار و پود اور رنگ و روپ کو ایک دوسرے سے الگ کرتا ہے تو پھر ایسی تحریر جنم لیتی

ہے جو لازوال ہو جاتی ہے۔ اخباروں کے اداریے، خصوصی رپورٹیں اور انویسٹی گیٹو اسٹوریز مدیر، نامہ نگار یا رپورٹر کے لیے جن جگر سوز اور جاں گسل مراحل سے گزرنے کے متقاضی ہوتی ہیں اور اسی تسلسل میں جس طرح اپنا خونِ جگر جلا کر قلم کی عظمت و حرمت کو زندہ رکھنا اور اس کے تقدس کی پابندی کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے اس کا احساس انصاف پسند اور دیانتدار صحافی اور اہلِ دل اور اہلِ نظر کو ہی ہو سکتا ہے۔ اداریہ نویس کسی بھی معاملے کے تجزیے کے دوران حقائق کی تہہ میں اتر کر جو نتیجہ اخذ کرتا ہے وہ مستقبل کے مورخ کے لیے اخبار کی جانب سے ایک گراں قدر عطیہ ہوتا ہے۔ جب کوئی واقعہ سنسنی پیدا کر دیتا ہے اور عوامی ذہنوں کو متاثر کرنے لگتا ہے تو اخبار نویس یا ایڈیٹر عمل کر سکتا ہے اور اپنے تجزیے و نظریے کی روشنی میں قارئین کو راستہ دکھاتا ہے۔ اگر ہم ہندو پاک میں صرف بیسویں صدی کی آخری اور اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں وقوع پذیر ہونے والے ہنگامہ خیز اور ہیجان انگیز واقعات کی رپورٹنگ پر نظر ڈال لیں تو اس بات کا بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ نامہ نگاروں اور رپورٹروں کی اکثریت نے کس طرح حق گوئی اور انصاف پسندی کی مثالیں قائم کی ہیں۔ ان کی رپورٹنگ محض رپورٹنگ نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد پر ایسی دستاویزات تیار ہو رہی ہیں جن کو مستقبل کا مورخ نظرانداز نہیں کر سکے گا۔

وقائع نگاری

بہرحال صحافت یا اخبار نویسی سے قطع نظر جب ہم تاریخ نویسی یا تاریخ سازی پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ ایک مورخ صرف مورخ ہی نہیں ہوتا وہ محقق بھی ہوتا ہے تاکہ اس کو اپنے ذخیرے سے بہتر نتیجے تک پہنچنے کی ضرورت ہوتی ہے وہ صحافت کی ایک شعبہ، مخبر جیسی ثابت ہوتی ہے۔ ہندوستان میں باضابطہ صحافت کے آغاز سے قبل بھی ایسی چیزیں موجود تھیں جو تاریخ نویسی میں معاون و مددگار تھیں۔ انھیں اگرچہ صحافت کے نام سے نہیں پکارا جاتا مگر وہ صحافت ہی کی ایک قسم تھی اور اسے وقائع نگاری کہا جاتا ہے۔ مطبوعہ صحافت سے قبل اسی کا چلن تھا اور انھیں بھی اخبار کہا جاتا تھا۔ یہ ہاتھ سے تحریر کیے جاتے تھے۔ چودھویں صدی میں سلطان علاءالدین خلجی کے زمانے سے اس کی تاریخ ملتی

ہے۔ انیسویں صدی میں ان قومی اخباروں میں تحریک آزادی کے سلسلے میں جو مواد ملتا ہے وہ ہماری جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہے۔ یہ قومی اخبار انگریز حکومت کے خلاف عوامی ذہنوں میں نفرت کی آگ اور آزادی کے جذبات کو تیز کرنے میں اہم رول ادا کر رہے تھے۔ ان اخباروں میں شائع خبروں اور مضامین سے انگریز افسران بری طرح خائف رہا کرتے تھے۔ ایک انگریز افسر لارڈ میکالے نے اپنی رپورٹوں میں ان قومی اخباروں کے خلاف دل کھول کر بھڑاس نکالی تھی اور انھیں برطانوی حکومت کے لیے انتہائی خطرناک قرار دیا تھا۔ تحریک آزادی کے ابتدائی ادوار کی تاریخ سازی میں ان اخباروں سے خاصی مدد لی جا سکتی ہے۔ ان اخباروں کی کاپیاں ملکی وغیر ملکی آرکائیوز میں مل جاتی ہیں۔ اس موضوع پر یونیورسٹی آف ایمسٹرڈم نے 1956 میں ڈاکٹریٹ کا ایک تحقیقی مقالہ منظور کیا تھا جس میں قومی اخباروں کے ریکارڈ کے مواخذ کی تفصیل دی گئی تھی۔ (قومی تحریک آزادی اور یوپی کے مسلمان صحافی۔ مقدمہ از جی ڈی چندن)۔

صحافت کے حوالے سے تحریک آزادی کا ذکر چھڑ گیا ہے تو اس سلسلے میں کچھ اور باتیں بھی سامنے آ سکتی ہیں۔ یہ دیسی اخبارات ہی تھے جنھوں نے یہ انکشاف کیا تھا کہ فوجیوں کے استعمال میں آنے والے کارتوسوں میں سور اور گائے کی چربی استعمال کی جاتی ہے۔ اس انکشاف نے دیسی فوج میں ایک آگ لگا دی تھی اور 22 فروری 1857 کو ہندوستانی فوج کی انیسویں پلٹن نے ان کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے سے انکار کر دیا تھا۔ اس خبر کی بھی دیسی اخباروں نے خوب تشہیر کی تھی۔ اس کے بعد ہی دیسی اخباروں پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ کیا اس خبر نگاری کو کوئی بھی ہندوستانی فراموش کر سکتا ہے اور کیا یہ واقعہ ہندوستان کی تاریخ آزادی میں سنگین مگر اہم واقعے کے طور پر نہیں جانا جاتا۔

عتیق صدیقی کی مرتب کردہ کتاب '1857 کے اخبار اور دستاویزیں' میں، جس کی ضخامت 447 صفحات پر مشتمل ہے، اس دور کے اخباروں کے تراشے جمع کر دیے گئے ہیں۔ لیکن یہ محض اخباروں کے تراشوں کا مجموعہ ہی نہیں ہے بلکہ جدوجہد آزادی کی تاریخ کا ایک عظیم الشان اور اولعزم باب بھی ہے۔ میں ان اخباروں کے اقتباسات کے زیادہ حوالے نہ دے کر صرف ایک اقتباس پر قناعت کرنا چاہتا ہوں جس میں 1857 کی بغاوت کے دوران شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کے

حالات کا تذکرہ ہے۔ لال قلعے کے شاہی روزنامچے سراج الاخبار کے مطابق جب شاہ کی سپاہ بغاوت کر کے اور دس مئی 1857 کی رات بھر سفر کرتے ہوئے گیارہ مئی کی صبح کو دہلی پہنچ کر مغل تاجدار کے حضور حاضر ہوئی تو ان کے سپہ سالار نے حضرت کی خدمت میں کمپنی حکام کی رعونت اور نجس کارتوسوں کے جبری استعمال کی شکایت کی اور فرنگی اقتدار سے نجات پانے کے لیے اپنی مہم میں ان کی قیادت مانگی تو روزنامچے کے مطابق بادشاہ نے ان کی فریاد سننے کے بعد جواب دیا ''سنو بھائی مجھے بادشاہ کون کہتا ہے۔ میں تو فقیر ہوں۔ ایک تکیہ لگائے ہوئے اپنی اولاد کو لیے بیٹھا ہوں۔ یہ بادشاہت تو (میرے آبائی) بادشاہوں کے ہمراہ گئی میری سلطنت برسوں پہلے ختم ہو چکی ہے میرے باپ دادا کے قبضے سے ملک نکل گیا، (وہ) قوت لایموت کے محتاج ہو گئے میں تو ایک گوشہ نشین آدمی ہوں۔ مجھے ستانے کیوں آئے ہو۔ میرے پاس خزانہ نہیں کہ میں تم کو تنخواہ دوں۔ میرے پاس فوج نہیں کہ میں تمھاری امداد کروں۔ میرے پاس کوئی ملک نہیں کہ تحصیل کر کے تم کو نوکر رکھوں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا مجھ سے کسی طرح کی توقع استطاعت کی نہ رکھو''

(بحوالہ اسلم پرویز بہادر شاہ ظفر اور اٹھارہ سو ستاون، سہ ماہی اردو ادب نئی دہلی خصوصی شمارہ اکتوبر تا دسمبر 2007)۔ کیا یہ اقتباس جو کہ سراج الاخبار سے نقل کیا گیا ہے جدوجہد آزادی کی تاریخ مرتب کرنے میں فرسٹ ہینڈ مواد کی حیثیت نہیں رکھتا کہ ایک بادشاہ خود اپنے احوال اور اپنی کسمپرسی کی داستان غم انگیز کس کربناک انداز میں بیان کر رہا ہے۔

اس دور کے کچھ اخبارات کی فائلیں نیشنل آرکائیوز میں بھی ہیں اور ملک کی مختلف لائبریریوں بالخصوص خدا بخش لائبریری پٹنہ، رضا لائبریری رامپور، مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ میں موجود ہیں۔ ایک ممتاز محقق ڈاکٹر سریندر ناتھ سین کے بقول 'نیشنل لائبریری کلکتہ کے ذخیرے میں 1857 کے اخباروں کے تراشوں کا ایک مجموعہ موجود ہے۔ واضح رہے کہ جب 1957 میں 1857 کی دوسری گولڈن جوبلی منائی جا رہی تھی تو اس وقت کے وزیر تعلیم مولانا ابوالکلام آزاد کی ہدایت پر ڈاکٹر سین نے 'قومی بغاوت' کی ایک معروضی تاریخ لکھی تھی جس کا نام 1857 ہے اور جو 470 صفحات پر مشتمل ہے۔ (بحوالہ مقدمہ اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857 معصوم مرادآبادی)۔

ان اخبارات و رسائل کی فائلوں کی آج غیر معمولی اہمیت ہے اور اسی اہمیت کے پیش نظر بڑی بڑی لائبریریوں میں ان فائلوں کی باقاعدہ جلد بندی کی گئی ہے۔ ان فائلوں کی بدولت نہ صرف سیاسی تاریخ سازی میں مدد ملتی ہے بلکہ ان دنوں کے معاشرتی احوال و کوائف کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ فائلیں قومی تاریخ کی مسودہ سازی میں اہم ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ لائبریریوں میں بے حسی و بے توجہی کی گرد چھٹک رہی ان فائلوں تک رسائی اور ان کی ورق گردانی کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔ کیا مولانا آزاد کے اخبار البلال اور البلاغ کی تاریخی اہمیت کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ کیا سراج الاخبار، دہلی اردو اخبار، اخبار الظفر اور صادق الاخبار کی معنویت کو وقت کی گرد ڈھانپ سکتی ہے۔ کیا مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ہمدرد، مولوی مجید حسین کے اخبار مدینہ، مولانا حسرت موہانی کے اردوئے معلی، قاضی عبدالغفار کے اخبار جمہور، طلسم لکھنؤ، اودھ اخبار، اخبار مشفق، سیاسی ترجمان، اودھ پنچ، زمیندار، اخبار خلافت، مسلم گزٹ، روزنامہ پیام، روزنامہ الجمعیۃ، روزنامہ قومی آواز، عصر جدید، شمع ہند، نئی روشنی، ہمدم اور ان جیسے ان لاتعداد اخباروں کو بھی مورخ فراموش کر سکتا ہے جنھوں نے نہ صرف جدوجہد آزادی کی چنگاری کو شعلہ جوالہ بنانے میں کلیدی رول ادا کیا بلکہ جنگ آزادی کی تاریخ سازی میں بھی نمایاں کردار نبھایا۔

ادبی تاریخ سازی

یہ تو سیاسی تاریخ سازی کی بات ہوئی۔ اس سے الگ ہٹ کر اگر ہم ادبی تاریخ سازی پر نظر ڈالیں تو اس میدان میں بھی اخبارات و رسائل نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اردو کی ادبی تاریخ کو مرتب کرنے میں بھی ان اخباروں سے خاصا کام لیا جا سکتا ہے۔ ایسے متعدد ادیب اور فنکار گزرے ہیں جو روزنامہ اخباروں سے وابستہ رہے ہیں اور جنھوں نے انہی اخباروں کے صفحات پر ادب کی تخلیق کی ہے۔ ان رسائل کی اہمیت و معنویت کے پیش نظر ہی ان کی اشاریہ سازی کا سلسلہ شروع ہوا جو آج بھی جاری ہے۔ مختلف رسائل کے خصوصی شمارے کے مرتب نے باقاعدہ شائع کیے جاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اردو رسائل کی باضابطہ اور کتابی صورت میں اشاریہ سازی کی

اہمیت و افادیت سب سے پہلے اورینٹل کالج میگزین کے فاضل مدیر مولوی محمد شفیع مرحوم کو ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 'مخزن' لاہور کے ایڈیٹر شیخ عبدالقادر بھی رسائل کی اشاریہ سازی کی افادیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ ماہانہ رسائل کی بہ نسبت ہفت روزہ رسائل کی اشاریہ سازی زیادہ مشقت و محنت اور دیدہ ریزی کی متقاضی ہے۔ راقم کی معلومات کے مطابق ہفت روزہ الہلال کلکتہ وہ ہفت روزہ تھا جس نے سب سے پہلے جلد کی تکمیل پر اشاریہ مرتب اور شائع کرنے کی روایت قائم کی۔ اس کے بعد ہفت روزہ اہلحدیث امرتسر ایسا ہفت روزہ ہے جس کی کسی جلد کا اشاریہ راقم کی نظر سے گزرا ہے"۔ غالباً ان رسائل کے مدیروں اور مالکوں کو اس کا اندازہ تھا کہ کسی زمانے میں ان کے پرچوں کی اہمیت کا احساس لوگوں کو ہوگا اور اسی وجہ سے انھوں نے ان کی اشاریہ سازی کی۔

ادبی تاریخ سازی کا ذکر چل پڑا ہے تو میں اسی کتاب سے ایک اور اقتباس پیش کر رہا ہوں جو بے موقع نہیں ہے۔ "ماہنامہ کلیم دہلی نے جب اپنی زندگی کے تین برس مکمل کر لیے تو اس کے ایڈیٹر جوش ملیح آبادی رسائل کی بے قدری اور رسائل کی کمی کو زیر بحث لاتے ہوئے جنوری 1938 کے شمارے میں کس قدر افسردگی، مایوسی اور پستی کا اظہار کر رہے ہیں۔ بقول ان کے کلیم کی بقا کے واسطے جتنے دروازے کھٹکھٹائے جا سکتے تھے میں نے ان سب کو کھٹکھٹایا اور بے حیا بن کر متعدد بار کھٹکھٹا چکا ہوں، مگر ایک دروازہ بھی نہیں کھلا۔ دروازہ کھلنا تو بڑی بات ہے کسی در پر یہ اندازہ بھی نہیں ہو سکا کہ اس مکان کی چار دیواری کے اندر سانس لینے والے زندہ لوگ بھی موجود ہیں کہ نہیں (جی چاہتا ہے) خانہ نشینی اختیار کر لوں، ایسی مکمل خانہ نشینی کہ تادم مرگ نہ تو کسی جلسے میں شریک ہوں، نہ کسی اخبار اور رسالے میں اپنا کلام چھپواؤں اور نہ تمام عمر کسی سے ملاقات ہی کروں"۔ جب بھی ماہنامہ کلیم کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو جوش ملیح آبادی کے اس مایوس کن اور افسردگی سے بوجھل تبصرے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا، جو اس بات کا گواہ ہے کہ ادب نواز حلقوں کی بے حسی نے جوش جیسی انقلابی شخصیت کو کس قدر پژمردہ کر دیا تھا۔

بہر حال صحافت صحافت ہے وہ مکمل اور باضابطہ تاریخ نہیں ہے۔ البتہ تاریخ نویسی کی گاڑی میں جب صحافت کا ایندھن پڑتا ہے تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ تاہم اس کا بھی جائزہ

جاننے کی ضرورت ہے کہ فلپ گراہم نے صحافت کو تاریخ کی خام یا ناہموار مسودہ سازی کیوں کہا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اخبار نویسی کے دوران ایک صحافی یا رپورٹر کو ان تمام مراحل سے گزرنا پڑتا ہے جو تاریخ سازی کے عمل میں ایک مورخ کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ ہاں اسے تاریخ کی خام مسودہ سازی اس لیے کہا گیا ہے کہ ایک صحافی ڈیڈ لائن کے شدید دباؤ کے تحت کام کرتا ہے اور اسے بہت کم وقت میں بہت زیادہ کام نمٹانے ہوتے ہیں۔ اس کے پاس مورخ کی مانند فاضل وقت نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایک واقعے اور ایک ایک رپورٹ کو Polish کر کے پیش کرے اور کاؤنٹر چیک کرنے کے بعد رپورٹ کو شائع ہونے کے لیے دے۔ حالانکہ اسے فریق اول و فریق ثانی سے خبر کی تصدیق کرنی چاہیے کیونکہ یہی صحافتی اصول ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ چاہنے کے باوجود ایسا نہیں کر پاتا اور وقت کی کوتاہ دامنی اسے اس اصول پر سختی سے کاربند رہنے سے روک دیتی ہے۔ بعض اوقات تو ڈیڈ لائن کا دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ اسے اپنی تحریر پر نظر ثانی کا بھی وقت نہیں ملتا۔ کبھی کبھی تو ایک اخبار نویس کو اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے بیک وقت کئی رپورٹوں کی کٹنگ اور ایڈیٹنگ کرنی پڑتی ہے۔ ایسے بھی اردو صحافی گزرے ہیں جو ایک ساتھ تین تین اور چار چار خبروں کا انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرتے اور کاتبوں کو دیتے جاتے تھے یا بیک وقت مختلف اور متضاد نوعیت کی خبریں بنایا کرتے تھے۔

اس کے ساتھ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ نامہ نگار یا رپورٹر آرائش بیان کے لیے بھی بہت سی باتیں لکھ دیتا ہے۔ ایسی رپورٹوں میں اظہار حقائق پر افسانہ نگاری حاوی ہو جاتی ہے۔ یہ مورخ کا کام ہے کہ وہ افسانہ و افسوں سے متاثر ہوئے بغیر حق اور ناحق میں امتیاز کرے۔ گیہوں اور بھوسی کو ایک دوسرے سے الگ کرے اور بھوسی کو کوڑے دان کی زینت بنا کر گندم سے اپنا دامن بھرے۔ اگر کوئی مورخ ایسا نہیں کرتا تو وہ تاریخ نویسی کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ یہاں ایک سوال یہ اٹھتا ہے کہ تاریخ نویسی کے تعلق سے اخبارات میں شائع مواد زیادہ معتبر ہے یا حکومتوں کی جانب سے تیار کی جانے والی رپورٹیں زیادہ معتبر و مستند ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک صحافی عجلت میں مسودہ سازی کرتا ہے تو حکومت کا ایک نمائندہ غیر جانبداری کو بالائے طاق رکھ کر دستاویز مرتب کرتا ہے۔ کیونکہ اس کی وفاداری کا تقاضا ہے کہ وہ حکومت کے موقف کو سامنے لائے

اور جو باتیں اس سے متصادم ہوں ان سے دامن کش ہو جائے۔ وہ حقائق نگاری پر حکومت سے وفاداری کو فوقیت دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ اسی لیے اس پر زیادہ بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سوال بھی کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک صحافی عجلت میں کام کرتا ہے تو اس کی تحریر کس حد تک لائق اعتبار ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ عجلت نویسی کے باوجود ایک سچا صحافی انصاف پسندی اور حق گوئی کو نہیں چھوڑتا۔ کیونکہ صحافت کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اصول یہ بھی ہے کہ صحافی کو سچائی کے تئیں وفادار اور عوام کے تئیں جواب دہ ہونا چاہیے۔ جو صحافی اس اصول کو حرز جاں بناتا ہے وہ لاکھ عجلت پسند سہی، اس کا قلم انصاف اور سچائی کی ڈگر سے نہیں ڈگمگاتا۔ لہٰذا یہ کہنے میں کوئی جھجک نہیں کہ تاریخ نگاری کے دوران صحافت کو سرکاری دستاویز پر فوقیت حاصل رہتی ہے۔ ایک مفکر نے کہا ہے کہ کسی بھی انسائیکلوپیڈیا کا کام ان واقعات کی بنیاد پر شروع ہوتا ہے جو اخباروں میں بکھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلپ گراہم کا قول نہ صرف سچا ہے بلکہ اب تو صحافت اس سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ کیونکہ صحافت کے تعاون کے بغیر تاریخ سازی نہیں ہو سکتی۔ اس تجزیے کی روشنی میں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ صحافت اور تاریخ سازی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلکہ چولی دامن کا محاورہ فرسودہ ہو گیا ہے۔ اب تو یہ کہنے میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی بہنیں ہیں، جڑواں یا سگی نہ سہی، دوری کا رشتہ سہی، مگر رشتہ ضرور ہے اور اس سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔

صحافت مشن ہے یا کچھ اور؟

صحافت مشن ہے یا کچھ اور؟ یہ سوال اکثر اٹھتا رہتا ہے۔ اس سوال کا جائزہ لینے کے لیے ماضی کے دریچے سے جھانکتے ہوئے حال کے منظر نامے پر نگاہ دوڑانی ہوگی۔ اردو صحافت کا آغاز تو مشن کے طور پر ہی ہوا تھا۔ رفتہ رفتہ اخبارات کی تعداد بڑھنے لگی اور ایک وقت وہ آیا جب ان اخباروں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کا بگل بجا دیا۔ جدوجہد آزادی کی آگ کے بھڑکنے کے ساتھ ساتھ اخباروں میں شائع ہونے والے مواد کی حدت اور شدت بھی بڑھتی رہی۔ انگریز حکومت کا عتاب ان پر نازل ہوتا رہا مگر وہ آگے بڑھتے ہی رہے۔ یہ سفر جو 1822 سے شروع ہوا تھا بالآخر 1947 کے تاریخی پڑاؤ تک آ گیا۔ اس عرصے میں جانے کتنے اخبار سنگلاخ چٹانوں سے نکلنے والی کونپلوں کی مانند نمودار ہوئے اور اپنی تحریروں سے ہندوستان کی جنگ آزادی کو گرم کیے رکھا۔ بڑی تعداد میں اخبار نکلتے اور بند ہوتے رہے۔ مظالم توڑے جاتے رہے اور اخبار شائع ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ اردو صحافت کی تاریخ میں ایک شہید صحافی کی داستان بھی جڑ گئی۔ لیکن اردو اخبارات پیچھے نہیں ہٹے اور بالآخر طویل جدوجہد کے افق پر آزادی کی صبح نمودار ہوگئی۔

لیکن تبدیلی قانون فطرت ہے اور صحافت بھی اس سے اچھوتی نہیں رہی۔ آزادی کے بعد کے 63 سالوں میں پورا منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے۔ صحافت میں کئی ابعاد جڑ گئے ہیں اور وہ مطبوعہ صحافت سے برقی صحافت یعنی پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا تک آ پہنچی ہے۔ پرنٹ میڈیا کا دامن بھی وسیع ہوا ہے اور الیکٹرانک میڈیا کا بھی۔ لیکن ثانی الذکر کا افق اول الذکر سے کہیں زیادہ وسیع اور کشادہ ہو گیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کثیر رخی ہے اور وہ رفتہ رفتہ تمام تر شعبہ ہائے حیات کو محیط ہوتا جا رہا ہے۔ ہم اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں پہنچ گئے ہیں۔ گزشتہ یعنی

پچھلی دہائی میں الیکٹرانک میڈیا نے اس قدر ترقی کی ہے کہ اس کی چکا چوند نگاہوں کو خیرہ کیے دے رہی ہے۔ ایک صدی قبل کی دنیا اور آج کی دنیا میں زمین آسمان کا فرق واقع ہو چکا ہے اور ایسی تبدیلی رونما ہوئی ہے کہ اگر ایک صدی قبل کا انسان آج کی دنیا میں آ جائے تو اسے یہ یقین ہی نہیں ہوگا کہ یہ وہی دنیا ہے جسے اس نے خیر باد کہا تھا۔ صحافت کے فروغ کے ساتھ ساتھ صحافیوں کے لیے قواعد و ضوابط بھی وضع کیے جاتے رہے، گائڈ لائن بھی بنتی رہی اور صحافتی اخلاقیات بھی تیار ہوتی رہیں۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ قواعد و ضوابط، گائڈ لائن اور صحافتی اخلاقیات بتدریج فرسودہ بھی ہوتی رہیں۔ رفتہ رفتہ مادی ترقی پوری دنیا پر اس طرح چھا گئی کہ اس نے ہمارے ذہنوں کو بھی متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ اس ترقی نے دنیا کو ایک عالمی بازار میں تبدیل کر دیا ہے اور اب یہی بازار تمام طرح کے فیصلوں میں دخیل ہو گیا ہے۔ صحافتی اخلاقیات بھی کسی حد تک منڈی کی پابند ہوئی ہیں اور قواعد و ضوابط بھی کسی قدر بازار کے مفاد کو سامنے رکھ کر وضع کیے جا رہے ہیں۔ جب صورت حال اتنی غیر معمولی ہو جائے یا اس طرح بازار کی تابع محض بن کر رہ جائے تو پھر یہ صحافی، یہ صحافت اور یہ صحافتی مشن۔ ترقیات زمانہ دوسری چیزوں کے ساتھ ساتھ مشن پر بھی اثر انداز ہوئی ہیں۔ جب ہم صحافتی مشن کی بات کرتے ہیں تو ہمیں اس کا اطلاق صرف اردو صحافت پر نہیں کرنا چاہیے۔ دوسری زبانوں کی صحافت بھی اس کے دائرے میں آتی ہے۔ لیکن اگر ہم صرف اردو صحافت ہی کا جائزہ لیں تو پائیں گے کہ بہر حال مشن اب بھی کسی نہ کسی شکل میں زندہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جاں بہ لب ہے اور ہماری خصوصی توجہ کا محتاج ہے۔ جب ہم اردو زبان اور اردو صحافت کی بات کرتے ہیں تو بڑے کرب کے ساتھ اردو کی زبوں حالی پر اظہار رنج بھی کرتے ہیں۔

لیکن اس کے متوازی ایک اور صورت حال قائم ہے جسے ہم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یعنی اردو اخباروں کی تعداد میں قابل ذکر حد تک اضافہ اور غیر اردو اداروں کا اردو صحافت میں داخلہ۔ چند سال پہلے تک یہ شکوہ کیا جاتا رہا ہے کہ کاروباری ادارے اردو اخباروں کو لائق اعتنا نہیں سمجھتے اور ان کی توجہ اس کی جانب نہیں ہے۔ (یہاں یہ سوال بھی قابل غور ہے کہ جب ہم صحافت کو مشن تصور کرتے ہیں تو اس جانب کاروباری اداروں کی بے توجہی کا شکوہ کہاں تک درست ہے)۔

بہر حال ایک بڑے صحافتی گھرانے انڈیا ٹوڈے کی جانب سے اردو انڈیا ٹوڈے نکالنے کے فیصلے اور پھر اس فیصلے کو منسوخ کرنے کے حوصلہ شکن حالات کے ایک عرصے بعد کاروباری گھرانوں نے اردو صحافت میں قدم رکھا ہے جس کے نتیجے میں اردو صحافت کا افق بہر حال کشادہ ہوا ہے۔ پہلے سہارا گروپ کے اردو صحافت میں آنے اور ماہنامہ اور ہفت روزہ کے علاوہ متعدد شہروں سے روزنامہ کے ایڈیشن نکالنے اور اس کے بعد دینک جاگرن گروپ کے ذریعہ ایک مقبول عام روزنامہ انقلاب کو خریدنے اور ایک دو کے اندر کئی شہروں سے اس کے ایڈیشنوں کی اشاعت اور ایک تاریخی اخبار آزاد ہند کے بھی ایک کاروباری گھرانے کے ذریعہ اپنا لیے جانے سے بلا شبہ ایک نئی صورت حال پیدا ہوئی ہے جو اب سے پہلے نہیں تھی۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ جب کاروباری ادارے کسی شعبے میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو ان کا مقصد اپنے کاروبار کو پھیلانا ہوتا ہے نہ کہ کسی مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا۔ اگر کوئی مشن ہوگا بھی تو اس کا بھی تعلق کسی نہ کسی طرح منفعت سے ہوگا۔ جو ضروری نہیں کہ مالی منفعت ہی ہو۔ میں اخبارات کے مالکوں اور مدیروں سے معذرت کے ساتھ یہ کہنے کی جسارت کر رہا ہوں کہ موجودہ دور میں صحافت کی جو شکل وصورت ہے اور وہ جس سمت میں آگے بڑھ رہی ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب مشن سے اس کا تعلق بس برائے نام رہ گیا ہے۔ جو بڑے اور کثیر الاشاعت اخبارات ہیں وہ بھی اور جو محض فیشن کے طور پر نکلتے ہیں وہ بھی مشنری جذبے سے خالی نظر آتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ قصور اس بازار کا ہے جو پوری دنیا پر حاوی ہے اور جس کو نظر انداز کر کے آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر بالخصوص چھوٹے اخباروں کے مالکان صرف مشنری جذبے سے کام کریں تو وہ ایک دن بھی اخبار نہیں نکال پائیں گے۔ اخبار کے اخراجات، کارکنوں کے اخراجات، اپنے ذاتی اخراجات اور اپنے اہل وعیال کی پرورش کی ذمہ داریاں ہاتھوں میں ہتھکڑی اور پیروں میں بیڑی بن کر لپٹ جائیں گی اور مالکان ومدیران سے کہیں گی کہ ہمیں ایسے مشن کی ضرورت نہیں جس کی وجہ سے ہم فاقہ کشی پر مجبور ہوں اور مقابلے کی اس دنیا میں خود کو اور اپنے بچوں کو بالکل آخری پائدان میں کھڑا کر دیں۔ تاہم اس تلخ مگر ناگزیر حقیقت کے ساتھ ساتھ راقم الحروف یہ بھی کہنا چاہے گا کہ ہم اگر مشن کے لیے کام

نہیں کر سکتے تو ہمیں مشن کے لیے بھی کام نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں بہر حال صحافتی اخلاقیات کو عزیز سمجھنا چاہیے اور محض منفعت کی خاطر غیر اخلاقی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہونا چاہیے۔ ہم بازار کے تقاضے بھی پورے کر سکتے ہیں اور صحافتی اخلاقیات کی پابندی بھی کر سکتے ہیں۔ شرط صرف اتنی ہے کہ حرص و ہوس کو خیر باد کہنا ہوگا اور ذلت کے گڑھے میں گرنے سے بچنا ہوگا۔ صحافت ایک مقدس اور باوقار پیشہ ہے۔ اس کے تقدس اور وقار کو بچائے رکھنے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ صحافت کی جو شبیہ ہمارے اسلاف نے روشن کی تھی اسے بازار کی بلاخیز آندھیوں سے بچانا ہوگا۔ اگر آج کے نامساعد حالات میں صحافی برادری ایسا کرنے میں کامیاب رہتی ہے تو یہ بھی ایک مشن ہوگا اور صحافت کے وقار کو زندہ رکھنے میں کسی قربانی سے کم نہیں ہوگا۔

صحافت اور جذباتیت کا کاروبار

موجودہ عہد سیاسی انتشار اور اقتصادی زوال کے پرآشوب دور سے گزر رہا ہے۔ پوری دنیا ایک قسم کی بے چینی اور اضطراب کا شکار ہے۔ خلیجی خطے اور شمالی افریقی ملکوں سے اٹھنے والی انقلاب کی چنگاری امریکہ اور یورپی ممالک تک پہنچ گئی ہے، اگرچہ شمالی افریقہ کے ملکوں میں بغاوت کی زیریں لہروں کے اسباب مختلف ہیں۔ لیکن ان کا بھی تعلق عوامی جذبات اور عوامی سروکار سے ہے۔ اول الذکر بغاوت جہاں حکمرانوں کے خلاف ہے وہیں ثانی الذکر حکمرانوں کے وضع کردہ اقتصادی نظام سے بیزاری کی پیداوار ہے۔ تاہم دونوں بے چینیوں، شورشوں اور بغاوتوں کی تہہ میں عوامی ناراضگی کی اصل محرک ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اٹھنے والے طوفان نے حکمرانوں کے ہوش اڑا دیے ہیں۔ وہ اس پر بند باندھنے میں ابھی تک ناکام ہیں۔ اس کے علاوہ دہشت گردی نے عالمی سیاست کی صورت حال کو مزید مخدوش بنا دیا ہے اور اب کوئی بھی خطہ زمین ایسا نہیں ہے جہاں تشدد اور خون خرابے کا اندیشہ نہ ہو۔ لیکن اگر ہم اندرون ملک کی بات کریں تو یہاں سطح پر بڑی آسودگی نظر آتی ہے مگر اس کی تہہ میں ایک ہلچل مچی ہوئی ہے جس میں کبھی بھی ابال آ سکتا ہے اور پرسکون سطح کے نیچے ذرا سی بات ہنگامہ خیز موجوں کو جگا سکتی ہے۔ دہشت گردی، شورش پسندی، فرقہ واریت، بدعنوانی اور معاشی لوٹ کھسوٹ نے ہمیں ایک جگہ پر لا کر کھڑا کر دیا ہے جہاں تیز ہوا کا ایک جھونکا ہمارے قدم اکھاڑ سکتا ہے اور ہم سب زوال کی گہرائیوں میں گر کر غرق ہو سکتے ہیں۔

جب بھی ایسے حالات پیدا ہوتے ہیں تو معاشرے کو منظم اور مستحکم بنائے رکھنے کی ذمہ داری تعلیم یافتہ طبقہ اور دانشوروں کے ساتھ ساتھ سماج کے بہی خواہوں کے دوش پر آ پڑتی ہے۔ انہی میں صحافی برادری بھی آتی ہے اور ان حالات میں اخباروں پر خاص قسم کے فرائض عائد

ہو جاتے ہیں۔ ایسے لمحات بڑے نازک ہوتے ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے پڑتے ہیں۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے کام لینا پڑتا ہے اور جذباتیت کو بالائے طاق رکھ کر ہوش و خرد کا راستہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس وقت جو حالات ہیں ان میں اردو صحافت پر بھی خاصی ذمہ داریاں آن پڑی ہیں۔ اگرچہ موجودہ عہد اردو زبان کا زوال آمادہ عہد ہے۔ اس کے باوجود اردو صحافت اپنی ذمہ داریوں سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتی۔ اردو صحافیوں نے کبھی بھی اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کی ہے اور کبھی بھی عوام کو گمراہ نہیں کیا ہے۔ خواہ وہ جدوجہد آزادی کا دور رہا ہو یا آزاد ہندوستان کا آزاد عہد ہو۔ انھوں نے اپنی ذمہ داریوں سے کبھی بھی منھ نہیں موڑا ہے بلکہ بڑھ چڑھ کر انھیں ادا کیا ہے۔ اردو اخباروں نے مشکل حالات اور فیصلہ کن گھڑیوں میں اپنے قارئین کی رہنمائی کی ہے اور یہ رہنمائی جذباتیت کے بحر میں مبتلا ہو کر نہیں بلکہ سنجیدگی اور اخلاص نیت کی بنیاد پر کی گئی ہے۔ ان اخباروں نے ہمیشہ قوم و ملت کے مفادات کو پیش نظر اور ذاتی فائدے کو پس پشت رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اخبارات کے صفحات پر جذباتیت کی خوش رنگ مگر مسموم تصویر سازی کرنے والوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے۔

ایک زمانہ تھا جب دوسری ریاستوں کی مانند اردو ٹیبلائڈ کا بھی بازار تھا اور اس کا خمار اردو قارئین پر چھایا ہوا تھا۔ وہ ہمیشہ جذباتیت کو ہوا دیتے رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے قلم سے اپنے قارئین کے ذہنوں میں جذباتیت کے انجکشن لگا کر ان کے ایک طبقے کو ایسی مدہوشی میں مبتلا کیے رکھا کہ انھیں سنجیدہ تحریریں گراں گزرتی رہیں۔ جب تک وہ جوش خروش میں ڈوبی ہوئی اور خون کو کھولا دینے والی گرم تحریریں نہیں پڑھ لیتے تھے ان کو چین نہیں آتا تھا۔ اس روش نے مسلمانوں کے ایک بہت بڑے طبقے کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا تھا۔ انھیں ایسے اخباروں میں چھپتے ہوئے مضامین ہی اچھے لگتے تھے۔ ان دنوں وہی اخبار پسند تھے جن کے ٹائٹل پر خون آلود تلوار لیے ہوئے اور سر پر عمامہ باندھے ہوئے اور گھوڑے پر سوار باریش مسلمان کی تصویر بنی ہو۔ بعد میں بعض روزنامہ اخباروں نے بھی یہی روش اختیار کی اور معیار پر جوش و جذبات کو ترجیح دی۔ لیکن بابری مسجد کے انہدام نے عام مسلمانوں کی بھی آنکھیں کھول دیں اور جذباتی مسلمانوں کی بھی۔ ٹیبلائڈ کا بازار مندا ہو گیا اور سنجیدہ صحافت کا دور پھر شروع ہوا۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ انھیں

[illegible] توازن کی ضرورت نہیں ہے۔ انھیں جوش و جذبات کے بجائے ہوش و خرد سے کام لینا ہوگا۔ انھیں دل کے بجائے دماغ سے سوچنا ہوگا۔ پھر ان میں تعلیم کی طرف رغبت ہوئی، جو ایک بہت ہی خوش آئند بات تھی۔ لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکا۔ ملک میں فرقہ وارانہ فسادات اور خاص طور پر گجرات کے فسادات نے تصویر بدل دی۔

انھی دنوں میں کچھ مدیروں نے حالات سے فائدہ اٹھا کر جذبات کی کھیتی پھر شروع کر دی۔ انھوں نے صحافت کو منڈی اور جذبات کو پروڈکٹ میں تبدیل کر دیا۔ ان گندم نما جو فروشوں کا مطمح نظر ذاتی مفادات کا حصول اور اپنے اخباروں کی اشاعت میں اضافہ تھا۔ اس لیے انھوں نے سنجیدگی و بردباری کو طاق رکھا اور جذباتیت کا کاروبار شروع کر دیا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ ان میں سے بیشتر صحافی صحافت کی دنیا میں چور دروازے سے داخل ہو گئے ہیں اور انھوں نے اپنے جعلی شناخت نامے بنوا لیے ہیں۔ بلکہ اس سے بھی آگے کی بات یہ ہے کہ بہت سے ایسے صحافی بھی پیدا ہو گئے ہیں جن کی اپنی کوئی آئیڈنٹٹی ہی نہیں ہے ان کے پاس جعلی شناخت نامے بھی نہیں ہیں۔ وہ صحافی یا ایڈیٹر نہیں بلکہ وہ صرف اور صرف منیجر ہیں۔ وہ حالات اور مواقع کو اپنے حق میں کیش کرنے کے ہنر میں طاق ہیں۔ ایسے ایڈیٹر اور صحافی چند سطور بھی ڈھنگ سے نہیں لکھ سکتے۔ یہ لوگ گھوسٹ رائٹرس کا پینل رکھتے ہیں جو مناسب یا غیر مناسب اجرتوں پر ان کے لیے کام کرتے ہیں اور کریڈٹ ایڈیٹر کے حصے میں جاتا ہے۔ چونکہ انھیں معلوم ہے کہ اگر وہ سنجیدہ اور تعمیری صحافت کریں گے تو ناکام ہو جائیں گے اسی لیے وہ زرد صحافت کے دامن میں پناہ ڈھونڈتے ہیں۔ ملک میں ہونے والے دہشت گردی کے واقعات اور ان میں بے قصور مسلم نوجوانوں کی گرفتاری کے ایشوز نے ان کو بہترین مواقع فراہم کیے اور انھوں نے مسلمانوں کی [illegible] کے نام پر ملک میں دو فریق کھڑے کر دیے۔ ایک طرف حکومت اور پولیس ہے تو دوسری طرف بے بس و لاچار مسلمان ہیں۔ انھوں نے اپنی دکان چمکانے کی خاطر مسلمانوں کے مستقبل سے کھیلنا اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا۔ لیکن اس چالاکی اور چترائی سے یہ کھیل کھیلا جاتا ہے کہ مسلمان سمجھ ہی نہیں پاتے کہ ان کے ساتھ فریب اور چھل کیا جا رہا ہے۔ وہ جذبات کو مشتعل کرنے والے صحافیوں کو ہی اپنا محسن و ہمدرد سمجھتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ دہشت گردی کے واقعات کے بعد ایسا ماحول بنا دیا جاتا ہے کہ مسلمان من حیث القوم دہشت گرد نظر آنے لگتے ہیں۔ ان کے گلے میں دہشت گردی کا طوق لٹکا دیا جاتا ہے اور ان کی فریاد سننے والا کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم جذبات سے کھیلیں اور قارئین کو تعمیری راستہ دکھانے کے بجائے گمراہی کے راستے پر کشاں کشاں لیے چلے جائیں۔ ناانصافی کے خلاف لڑائی ہر شخص کو لڑنی چاہیے، یہ ذمہ داری صرف صحافیوں کی نہیں بلکہ ہر انصاف پسند شہری کی ہے۔ لیکن اس لڑائی کے دوران بہت ہشیاری کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ کہیں ان کی لڑائی کسی دوسری سمت میں نہ مڑ جائے اور اس سے خود انہی کو نقصان نہ پہنچ جائے۔

پیشہ صحافت باوقار بھی خطرناک بھی

صحافت کا پیشہ دوسرے تمام پیشوں سے مختلف ہے۔ ایک صحافی کی خواہ وہ مطبوعہ صحافت سے تعلق رکھتا ہو یا برقی صحافت سے، بہت سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کو دیانتداری کے ساتھ انجام دینا ہوتا ہے۔ جہاں اس کی نظر دنیا بھر کے حالات و واقعات پر ہوتی ہے وہیں دنیا بھر کی نظریں اس پر ہوتی ہیں۔ ایک صحافی اگر ایماندار اور اپنے فرائض کے تئیں سنجیدہ ہے تو سماج میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ سماج اس سے بہت کچھ توقعات رکھتا ہے اور یہ امید بھی رکھتا ہے کہ وہ اہم امور و معاملات پر اس کی بہتر رہنمائی کرے گا۔ لیکن یہ ایک ایسی وادی ہے جو پھولوں سے نہیں کانٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس وادی میں قدم رکھنا چہل قدمی کرنا نہیں انگاروں پر چلنا اور پھولوں کے گداز بستر پر نہیں کانٹوں کی سیج پر سونا ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا پیشہ ہے جو مقدس بھی ہے، باوقار بھی ہے اور اسی کے ساتھ انتہائی خطرناک بھی ہے۔ قدم قدم پر خدشات و خطرات کا سامنا ہے اور ان کا مقابلہ کرنا آسان نہیں۔ بہت سے صحافیوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی میں اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ گو یہ ایک ایسا پیشہ ہے جو جان دینے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ صحافت متاع حیات کو ہتھیلی پر لے کر چلنے کا نام ہے۔ اگر حالات سازگار نہ ہوں اور اس متاع حیات کے قدم قدم پر لٹنے کے خطرات موجود ہوں تو صحافت کا چراغ جلائے رکھنا اپنے دل کو روشن کر کے چراغ بجھا دینے سے بھی کہیں زیادہ مشکل ہے۔ لیکن آفریں ہے ان صحافیوں کو جو جوکھم قتل میں بھی شاہانہ انداز میں مقتل جاں سے گزرنے اور اپنے خون سے شمع مقتل کی لو کو تیز کرنے میں یقین رکھتے ہیں۔

نظر چرا کے چلو جسم و جاں بچا کے چلو!

صحافی برادری دنیا بھر میں خطروں سے گھری ہوئی ہے۔ دفتر میں بیٹھ کر کام کرنا ہو یا فیلڈ رپورٹنگ کرنی ہو دونوں میں جان جانے کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ افغانستان اور عراق جیسے ملک جو کہ حالت جنگ میں ہیں صحافیوں کے لیے انتہائی مخدوش اور خطرناک ہیں۔ پاکستان بھی ایک ایسا ملک بن گیا ہے جہاں صحافیوں کو سچ بولنے کی قیمت چکانی پڑ رہی ہے۔ پاکستان کا خطہ وزیرستان صحافیوں کی بعض تنظیموں کے مطابق صحافیوں کے لیے دنیا کا خطرناک ترین خطہ ہے۔ ہندوستان میں اگرچہ صحافیوں کو وہ خطرات لاحق نہیں ہیں جو پاکستان میں ہیں لیکن یہاں بھی صحافت کرنا عافیت کدوں میں بیٹھنا نہیں، وادی پرخار میں دوڑ لگانا ہے۔ خاص طور پر کشمیر کے صحافی ہمیشہ تلوار کی دھار پر رہتے ہیں۔ کب کس کے نام موت کا وارنٹ نکل جائے کہا نہیں جا سکتا۔ ہندوستان میں 1992 سے 2011 کے دوران کم از کم تیس صحافیوں اور پاکستان میں گذشتہ سترہ برسوں کے دوران کم از کم چالیس صحافیوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ پاکستان جس قسم کی اندرونی و بیرونی سازشوں کا شکار ہے اور جس نوعیت کی جنگوں میں ملوث ہے وہ نہ تو کسی تعمیری کاز کے لیے سازگار ہیں اور نہ ہی صحافتی فرائض کی ادائیگی کے لیے معاون۔ لیکن اس کے باوجود صحافیوں کا طبقہ اپنے فرائض منصبی کی انجام دہی میں تن من دھن سے مصروف ہے۔ پاکستان کے ایک دیدہ ور، باخبر، انصاف پسند اور سینئر صحافی سید سلیم شہزاد کے وحشیانہ قتل نے جہاں پاکستان میں صحافیوں کے لیے حالات کو مزید سخت کر دیا ہے وہیں ممبئی کے ایک صحافی جے ڈے کے وحشیانہ قتل نے ہندوستان میں صحافیوں کو لاحق خطرات کی جانب اشارہ کیا ہے۔ پاکستان کے بارے میں صحافی تنظیموں کو زیادہ تشویش لاحق ہے۔ ان کا یہ اندیشہ بجا طور پر درست محسوس ہوتا ہے کہ سرزمین مملکت خداداد صحافیوں کے لیے روئے زمین پر سب سے زیادہ خطرناک اور غیر محفوظ خطہ ہے۔ وہاں کے حالات چیخ چیخ کر صحافیوں سے کہہ رہے ہیں کہ نظر چرا کے چلو، جسم و جاں بچا کے چلو۔

سال 2011 میں پاکستان میں تقریباً نصف درجن صحافیوں کا قتل ہوا ہے۔ وہاں کے برسر کار صحافی ہمیشہ سے ہی خطروں میں گھرے رہے ہیں۔ اب تو وہ شعلہ بداماں، پابجولاں اور

صلیب بردار ہو کر اس خارزار رزم گاہ کی بادیہ پیمائی کر رہے ہیں اور سچی بات یہ ہے کہ یہی وہ حقیقی سنانی ہیں جن کے دم قدم سے دنیائے صحافت میں رونق ہے اور سچائی کا نام زندہ ہے۔ صحافیوں کی ایک بین الاقوامی تنظیم ''انٹرنیشنل فیڈریشن آف جرنلسٹس'' کے مطابق پاکستان میں اب تک 101 صحافیوں کا قتل کیا جا چکا ہے۔ سید سلیم شہزاد سے قبل پشاور میں ایک قبائلی صحافی نصر اللہ آفریدی کی کار میں دھماکہ ہوا تھا اور وہ زندہ جل کر ہلاک ہو گئے تھے۔ اس سے قبل وادی سوات میں جیو نیوز کے نامہ نگار موسیٰ خان کا بہیمانہ قتل ہوا تھا۔ لیکن یہ بھی سچائی ہے کہ پاکستان واحد ملک نہیں ہے جہاں صحافیوں کو اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑتا ہے۔ آج پوری دنیا میں آواز حق بلند کرنے والوں کو اس کی بھرپور قیمت ادا کرنی پڑ رہی ہے۔ ان کی آواز دبانے کے لیے صرف دہشت گرد اور انتہا پسند تنظیمیں ہی سرگرم نہیں ہیں بلکہ بعض حکومتوں کی جانب سے بھی صحافیوں پر یہ ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ طاقتور حکومتیں ان کی آواز کو دبانے کی بھی کوشش کرتی ہیں اور خریدنے کی بھی۔ وہ اس کے لیے منھ مانگی قیمت اور دنیا جہان کی آسائشیں دینے کو تیار رہتی ہیں۔

سلیم شہزاد ایک غیر ملکی ویب اخبار ایشیا ٹائمز آن لائن کے اسلام آباد میں بیورو چیف تھے۔ 27 مئی 2011 کے شمارے میں انھوں نے کراچی میں پاکستانی بحریہ کے اڈے پر ہوئے دہشت گردانہ حملے سے متعلق ایک اسٹوری شائع کی تھی اور اعلان کیا تھا کہ اس کی دوسری قسط جلد ہی آئے گی۔ لیکن اس کی نوبت نہیں آئی اور 29 مئی کو وہ اچانک لاپتہ ہو گئے۔ انھیں ایک ٹی وی شو میں جانا تھا۔ وہ اپنے آفس سے اس کے لیے نکلے تھے لیکن وہاں نہیں پہنچ سکے اور پھر یہ خبر آئی کہ وہ غائب ہو گئے۔ 30 مئی کو پنجاب ضلع کے منڈی بہاءالدین میں ایک نہر کے کنارے جھاڑیوں میں ان کی لاش پائی گئی۔ لاش پر تشدد کے نشانات تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ انھیں کافی اذیتیں دی گئی ہیں۔ بعد میں پوسٹ مارٹم سے یہ بات درست پائی گئی۔ چالیس سالہ شہزاد ایک انویسٹی گیٹو جرنلسٹ تھے۔ ان کی تحقیقاتی رپورٹیں بہت معلوماتی ہوتی تھیں اور ان رپورٹوں سے بہت سے لوگوں کو پریشانی بھی تھی۔ لیکن وہ نہ تو کبھی کسی سے دبے اور نہ ہی کسی سے کوئی سودے بازی کی۔ پاکستان کے معروف کالم نگار عرفان صدیقی کے مطابق ''سلیم کی باخبری اس کا اصل جرم تھا۔ وہ بہت سے چہروں کے پیچھے چھپے چہروں کو پہچانتا تھا۔ اسے بہت سی مقدس عباؤں اور قباؤں کے

تانے بانے کا علم تھا۔ وہ ایسی ایسی کہانیاں لکھنے لگا تھا جو بڑے بڑے ایوانوں میں بھونچال لا رہی تھیں۔ وہ ہولے ہولے ایسے مقدس منطقوں میں داخل ہو رہا تھا جہاں آدمی ایک پھونک مارنے سے پتھر بن جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کا چراغ ہتھیلی پر دھرے تیز ہواؤں کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ اسے خبر تھی کہ اس دیس میں ایسی گستاخیوں کی سزا کتنی کڑی ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے اندر ہمہ وقت خطرے کی گھنٹیاں سی بجتی رہتی تھیں۔ کئی قریبی دوستوں کو اس نے بتا بھی رکھا تھا کہ اسے اپنے چار سو کس طرح کی آہٹیں سنائی دیتی ہیں لیکن پسپائی اور شکست اس کے شیوہ ہنر میں حرام تھی''۔ اس سے قبل 2006 میں بھی سلیم شہزاد کا اغوا کیا گیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ اس کے بعد طالبان اور القاعدہ میں ان کے بہت سے ایسے با رسوخ ذرائع بن گئے تھے جو انتہائی معلوماتی خبریں فراہم کرتے تھے اور ان لوگوں سے ان کو ایسی اطلاعات ملتی رہتی تھیں جو عام طور پر دوسرے صحافیوں کو نہیں مل پاتی تھیں۔ انھوں نے جو آخری اسٹوری شائع کی تھی اس میں انکشاف کیا تھا کہ پاکستانی بحریہ کے متعدد افسران کے القاعدہ سے گہرے رشتے ہیں۔ ایسے سنسنی خیز انکشافات کی قیمت ان کو اپنی جان گنوا کے دینی پڑی۔

صحافیوں کے لیے خطرناک ترین ملک

وائس آف امریکہ کی ایک رپورٹ میں بھی پاکستان میں صحافیوں کو درپیش خطرات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق پاکستان کو گذشتہ کچھ عرصے سے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے ان میں ذرائع ابلاغ کی آزادی کی راہ میں حائل دشواریاں بھی شامل ہیں۔ صحافیوں کی تنظیم ''کمیٹی فور پروٹیکشن آف جرنلسٹس'' نے گذشتہ سال کی اپنی رپورٹ میں پاکستان کو صحافیوں کے لیے خطرناک ترین ممالک کی فہرست میں شامل کیا تھا۔ رپورٹ کے مطابق 2010 میں دنیا بھر میں اپنے فرائض کی بجا آوری کے دوران ہلاک ہونے والے 57 صحافیوں میں سے گیارہ کا تعلق پاکستان سے تھا۔ اگرچہ ملک میں دہشت گردی کے واقعات میں کچھ کمی آئی ہے لیکن ذرائع ابلاغ سے متعلق بین الاقوامی تنظیموں کا کہنا ہے کہ صحافیوں کے لیے مشکلات اب بھی بدستور موجود ہیں۔

پاکستانی صحافت کے پرخار میدان میں تقریباً 22 برسوں سے موجود اور پاکستان میں آزادیٔ صحافت کی جدوجہد میں ایک جانا پہچانا نام جگنو محسن کا ہے جو آجکل ایک امریکی تھنک ٹینک سے اسکالر کے طور پر منسلک ہیں۔ جگنو کے مطابق پاکستان میں سچ لکھنے کے لیے ایک آزاد ماحول کے پنپنے کے حوالے سے انھیں اتنی مایوسی پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی جتنی کہ آج ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ پاکستان میں آزادیٔ صحافت کو اس وقت سب سے زیادہ خطرہ دہشت گرد تنظیموں سے ہے اور ان سرکاری اداروں سے جو ان تنظیموں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔ جگنو کہتی ہیں کہ اب پاکستان میں آزادیٔ صحافت کو سلب کرنے والی طاقتوں کے خلاف مزاحمت کی تمام کوششیں غیر موثر ہو چکی ہیں کیونکہ اب صحافیوں پر ہونے والے مظالم کی شنوائی کرنے والا کوئی نہیں۔ سید سلیم شہزاد کے قتل نے ایک مرتبہ پھر پاکستان میں صحافیوں کو درپیش مسائل کو عالمی توجہ کا مرکز بنا دیا ہے۔ جگنو محسن کی رائے میں ایسے واقعات دوسرے صحافیوں کی اپنے پیشے سے دیانتداری کے عزم کو چیلنج اور آزادیٔ صحافت کو متاثر کرتے ہیں۔

''کمیٹی فار دی پروٹیکشن آف جرنلسٹس'' کا دفتر نیویارک میں ہے، جس نے گزشتہ سال پاکستان کو صحافیوں کے لیے دنیا کا خطرناک ترین ملک قرار دیا تھا۔ اس تنظیم کے ایشیا پروگرام کوآرڈینیٹر باب ڈیئز کہتے ہیں کہ پاکستانی صحافیوں پر انتہا پسندوں، حکومت، فوج اور سیاسی قوتوں سمیت کئی اطراف سے شدید دباؤ آزادیٔ صحافت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حالات کا سامنا کرنے کے لیے تو آپ صحافیوں کی تربیت اور انھیں ضروری سامان مہیا کر کے تیار کر سکتے ہیں اور پاکستان میں اس پر کام بھی شروع ہو چکا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہے کہ اس سال قتل ہونے والے چھ صحافیوں میں سے چار کو ہدف بنا کر مارا گیا تھا۔ صحافیوں کو ان کے قتل پر آمادہ قاتلوں سے بچانا مشکل کام ہے۔ حکومت مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا کر ایسے عناصر کی حوصلہ شکنی کر سکتی ہے۔ لیکن ہمیں پاکستان میں ایسا دکھائی دیتا ہے کہ صحافیوں کو ہلاک کرنے والوں کے دلوں میں قانون کا کوئی خوف نہیں۔ جگنو محسن کہتی ہیں کہ جب وہ امریکی صحافت کا موازنہ پاکستان سے کرتی ہیں تو یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتیں کہ پاکستانی صحافی نسبتاً زیادہ دلیر ہیں۔ امریکہ میں لوگ بہت خوش قسمت ہیں کیونکہ انھیں اتنی جدوجہد نہیں کرنی پڑتی۔ اپنی جان کی بازی نہیں لگانی پڑتی۔

لیکن انھوں نے بھی ایک طویل جدوجہد کی ہے اور وہ اس سے ابھی گزر رہے ہیں۔

ہندوستان میں بھی صحافی غیر محفوظ

ہندوستان میں صحافیوں کے لیے سب سے خطرناک علاقے وہ ہیں جہاں علیحدگی پسندی اور مسلح تشدد کا دور دورہ ہے۔ ریاست جموں و کشمیر ہندوستان میں صحافیوں کے لیے سب سے خطرناک علاقہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہاں صحافیوں سے وحشیانہ سلوک کی بڑی ایک تاریخ ہے۔ کشمیر کے صحافیوں پر [illegible] افتخار گیلانی کشمیر سے تعلق رکھنے والے ایک سینئر صحافی ہیں جو دہلی میں رہتے ہیں۔ انھوں نے کشمیر میں صحافیوں کے حالات پر ایک معلومات افزا مضمون تحریر کیا ہے جو 21 جون 2011 کے روزنامہ [illegible] کی اشاعت میں شائع ہوا ہے۔ اس مضمون کی تلخیص ذیل میں پیش کی جا رہی ہے تاکہ کشمیر میں صحافی برادری کن خطرات کا سامنا کرتے ہوئے کام کر رہی ہے اس کا اندازہ لگایا جا سکے۔

افتخار گیلانی کے مضمون کی تلخیص

[illegible] میں اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریاں ادا کرتے ہیں۔ چند سال قبل ہندی روزنامہ امر اجالا کا ایک رپورٹر خوش قسمتی سے [illegible] ذہنی انتشار کا شکار ہوتے ہوتے بچ گیا تھا۔ [illegible] بی بی سی اردو سروس سے وابستہ [illegible] صحافی نعیم احمد مہجور

کے خلاف ایف آئی آر درج کی ہے۔ پولیس نے نعیم پر سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ فیس بک کے ذریعہ تشدد بھڑکانے کا الزام عائد کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ 26 جون 2011 کو سری نگر کے لال چوک سے ایک تاجر محمد فضل خان نامی ایک 55 سالہ شخص کو دن دہاڑے گرفتار کر دیا گیا تھا۔ پولیس کہتی ہے کہ نعیم احمد مہجور نے اس کے لیے پولیس کو مورد الزام ٹھہرایا ہے جبکہ اصل بات یہ ہے کہ نعیم نے میڈیا رپورٹوں کے حوالے سے صرف اتنا لکھا ہے کہ ''آخر پولیس کسی تاجر کو ہلاک کیوں کرے گی''۔ کشمیر میں 2010 میں موسم گرما کے واقعات اور اس سے قبل 2008 میں امرناتھ اراضی تنازعہ کے دوران یہ بات ثابت ہوگئی تھی کہ کشمیر میں کام کرنے والے صحافیوں کو تلوار کی دھار پر چلنا پڑتا ہے۔ حکام کی طرف سے صحافیوں کو کرفیو پاس نہیں جاری کرنے اور فورسز کے ذریعہ ہراساں کرنے کی وجہ سے سری نگر سے شائع ہونے والے تقریباً تمام اخبارات کو 2008 اور 2010 کی شورش کے دوران کئی دنوں تک اپنی اشاعت بند رکھنی پڑی۔ لیکن صحافیوں اور اخبارات کی مدد کی تنظیمیں مثلاً پریس کونسل آف انڈیا، ایڈیٹرس گلڈ اور دیگر تنظیموں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی۔ 1990 میں عسکریت کے آغاز کے بعد سے اب تک ان میں تقریباً ایک درجن صحافی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو چکے ہیں۔ تشویش کی بات یہ ہے کہ کشمیر میں صحافت کی روح کو زندہ و تابندہ رکھنے والے ان صحافیوں سے متعلق واقعات کو چھوڑ کر قومی یا بین الاقوامی صحافی برادری کی طرف سے بھی انھیں نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ان ناگفتہ بہ حالات میں سب قصور شدت پسندوں سے متعلق متعدد معاملات ان دنوں سامنے آتے ہیں لیکن یہ بات قابل ذکر ہے کہ جبراً لاپتہ کیے جانے کا سب سے پہلا معاملہ جو 1989 میں روشنی میں آیا تھا، وہ ایک صحافی کا ہی تھا۔ محمد صادق شوری اردو ''پندرہ روزہ نگینہ'' میں سینئر کاتب تھے۔ ایک دن جب وہ اپنے دفتر سے گھر کیلئے روانہ ہوئے تو پھر کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے۔ جنگجوؤں کی طرف سے میڈیا کو دھمکیاں دینے، صحافیوں کا اغوا کرنے اور اخبارات کی اشاعت بند کرانے کے بے شمار واقعات ہیں لیکن حکومت بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں رہی۔ معروف صحافی شجاعت بخاری کو گزشتہ سال نامعلوم بندوق برداروں نے اغوا کر لیا تھا لیکن خوش قسمتی سے وہ ان کے چنگل سے نکل بھاگنے میں کامیاب رہے۔ 1991 میں ''الصفا'' کے ایڈیٹر محمد شعبان وکیل کے قتل کی طرح صحافیوں کے

قتل اور ان پر حملوں کے درجنوں واقعات پر اب بھی اسرار کے دبیز پردے پڑے ہوئے ہیں۔ 1992 میں ایک اور کاتب غلام محمد صباجن کو پرانے سری نگر میں ان کی رہائش گاہ سے کھینچ کر ان کے چھوٹے بھائی کے ساتھ سرعام گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ایک اہم سیاسی پارٹی کے رہنما نے ایک روزنامہ کے ایڈیٹر کو صرف اس لیے سر بازار میں ننگے پاؤں گھومنے پر مجبور کیا کیونکہ اخبار نے ایک ایسی رپورٹ شائع کردی تھی جس سے پارٹی کے مفادات پر آنچ آتی تھی۔ اپنی خبروں پر بعض سیاسی جماعتوں نے معروف روزنامہ "چٹان" کے دفتر پر حملہ کر کے تباہ کر دیا تھا۔ تقریباً ایک سال قبل مدت سے پہلے چلے جانے والے شجاعت بخاری کہتے ہیں کہ جب بھی رات دیر گئے فون کی گھنٹی بجتی ہے تو ان کے جسم میں خوف کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں اگر آپ سیکورٹی فورسز کی زیادتیوں کی خبریں دیتے ہیں تو آپ پر ملک دشمن کا لیبل چسپاں کر دیا جاتا ہے۔ دوسری طرف اگر آپ جنگجوؤں کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کو تحریک (آزادی) مخالف قرار دے دیا جاتا ہے۔ آپ کے سر پر دونوں کی تلواریں لٹکتی رہتی ہیں۔ (افتخار گیلانی نے مزید دوسرے صحافیوں کے خلاف کارروائیوں اور کئی صحافیوں کے قتل کے دیگر واقعات بھی بیان کیے ہیں جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جموں و کشمیر میں صحافیوں کے لیے اپنی ذمہ داریاں انجام دینا کتنا مشکل اور خطرناک ہے)۔

عالمی صورت حال

سن 2011 کو یورپ اور امریکہ میں معاشی اور سیاسی مشکلات اور مشرق وسطی میں تبدیلیوں کے سال کے طور پر یاد کیا جائے گا۔ یہ سال صحافت کے شعبے کے لیے بھی آزمائش کا سال ثابت ہوا ہے۔ عرب دنیا میں انقلابی تبدیلیوں کے بعد حکومت کے متعلق اب میڈیا پر پابندیوں میں نئے اضافے ہوئے اور دوسری طرف برما، چین اور شمالی کوریا میں عالمی دباؤ کے باوجود پریس اور اظہار رائے کی آزادی کی راہ میں پہلے کی طرح روڑے اٹکانے کا سلسلہ جاری ہے۔ دنیا بھر میں اظہار رائے کی آزادی کی صورتحال پر نظر رکھنے والے ایک غیر سرکاری ادارے "فریڈم ہاؤس" کی پریس آزادی سروے رپورٹ بتاتی ہیں کہ میڈیا کی آزادی کو قائم رکھنے میں عرب خطے

[illegible] ایک بڑا چیلنج ہے۔ [illegible] میں بھی صحافیوں کی آزادی کو
[illegible] جمہوریت [illegible] تحریکوں میں عموماً جن مقاصد
[illegible] فہرست ہوتی ہے۔ مگر کچھ
[illegible] پابندیاں لگا دی گئی ہیں۔
[illegible] سب سے مخدوش حالات رکھنے
[illegible] 2011 میں [illegible] فہرست میں [illegible]
شامل ہیں [illegible]
[illegible] آزادی پر سخت
[illegible] کی بات کی جائے تو اس
فہرست میں [illegible] 2011 کے
[illegible]
[illegible] فہرست [illegible]
[illegible] ماہرین کا کہنا ہے کہ معلومات تک رسائی اور اظہار
[illegible] ذمہ داری ہوتی ہے جو کہ مضبوط جمہوریت کی
[illegible]

اردو صحافت میں کارپوریٹ سیکٹر کا داخلہ
کتنا مستحسن، کتنا خطرناک؟

آج کل اردو صحافت تبدیلی کے دور سے گزر رہی ہے۔ یہ تبدیلی مختلف سطحوں پر دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے۔ وہ بنیادی ڈھانچے کا شعبہ ہو یا معیار و کاروبار کا، یا پھر قارئین کی بتدریج کم ہوتی ہوئی تعداد کا۔ ہر شعبہ تغیر پذیر ہے اور بدلتے ہوئے حالات سے متاثر ہے۔ لیکن ان دنوں جو معاملہ شدت کے ساتھ زیر بحث ہے وہ اردو صحافت میں کارپوریٹ سیکٹر کی آمد ہے۔ اس پر ملا جلا ردعمل ظاہر کیا جا رہا ہے۔ کچھ لوگ اسے اردو صحافت کے لیے مبارک، مفید اور خوش آئند تبدیلی گردانتے ہیں تو کچھ لوگ اپنے خدشات کا اظہار کر رہے ہیں۔ خدشات کا اظہار کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ بعض اخباروں میں مضامین بھی شائع کیے گئے ہیں جن میں اس نئی صورت حال کے ممکنہ خطرات سے قارئین کو بالخصوص غیر مسلموں کو خبردار اور ہوشیار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ملک کی اردو صحافت میں ایک کارپوریٹ ادارہ "سہارا" گروپ کئی برسوں سے موجود ہے۔ اس نے ہندی اور انگریزی کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اخبار کا آغاز کیا اور آج اس ادارے سے روزنامہ اور ہفت روزہ کے ساتھ ساتھ ایک ماہنامہ جریدہ بھی نکل رہا ہے۔ اس کے علاوہ جالندھر سے ایک اردو روزنامہ "ہند سماچار" ایک طویل عرصے سے نکل رہا ہے۔ اسے جگت نرائن نے جو کہ پاکستان سے ہجرت کر کے جالندھر آئے تھے، 1948 میں جاری کیا تھا۔ پنجاب میں جاری دہشت گردی کی مخالفت کی وجہ سے 9 ستمبر 1981 کو ان کا قتل کر دیا گیا تھا۔ آزاد ہندوستان میں وہ اردو کے پہلے شہید صحافی کہے جا سکتے ہیں۔ پرتاپ اور ملاپ بھی نکل رہے ہیں

جن کو مسلمان بہت کم پڑھتے ہیں۔ پہلے ایک اور بعد میں کئی اور شہروں سے نکلنے والے کانگریس کے اخبار روزنامہ "قومی آواز" کی بھی مثال دی جا سکتی ہے۔ مذکورہ اردو اخباروں کے سلسلے میں ابھی بھی تشویش کا اظہار نہیں کیا گیا۔

اردو اخباروں کی سیل

اردو صحافت میں سہارا گروپ کے آنے کے بعد ایک دہائی سے بھی زیادہ عرصے تک کسی دوسرے ادارے نے اس میدان میں داخل ہونے کی جرأت نہیں کی۔ درمیان دنوں میں ہمارا سمدھیہ اردو ادارے سے نکلنے والا روزنامہ خبریں ضرور تھا۔ اس کے بعد کلکتہ کے ایک تاریخی اخبار روزنامہ "آزاد ہند" کو ایک غیر اردو ادارے "شاردا گروپ آف چٹ فنڈ کمپنیز" نے خرید لیا اور اب وہی اسے نکال رہا ہے۔ یہ اخبار مولانا ابوالکلام آزاد کے ایک دیرینہ رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے جاری کیا تھا اور بعد میں ان کے بیٹے احمد سعید ملیح آبادی نکالتے رہے ہیں۔ لیکن انہوں نے اسے فروخت کر دیا۔ اس تاریخی اخبار کے بکنے کے بعد اردو حلقوں میں تشویش کی ایک زیریں لہر دوڑ گئی لیکن اس پر کوئی باضابطہ ردعمل سامنے نہیں آیا تھا۔ اسی دوران 1938 سے ممبئی سے نکلنے والا ایک معیاری اخبار "انقلاب" بھی فروخت ہو گیا جس پر اردو کے کچھ حلقوں کو مزید تشویش ہوئی۔ ابھی تشویش کی یہ لہر کم بھی نہ ہوئی تھی کہ کثیر الاشاعت ہندی اخبار "دینک جاگرن" کی انتظامیہ نے خرید لیا۔ ایسی اطلاعات ہیں کہ "این ڈی ٹی وی اردو" بھی بک گیا ہے یا اس سلسلے میں بات چیت چل رہی ہے۔ یہ بھی سننے میں آ رہا ہے کہ سرکردہ انگریزی اخبار "ہندوستان ٹائمز" بھی اردو اخبار نکالنے کے امکانات پر سنجیدگی سے غور کر رہا ہے۔

اہم سوال

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ اردو صحافت کی جانب محبت بھری نظروں سے اچانک کیوں دیکھنے لگے جن کا کردار اردو زبان کے حوالے سے واضح نہیں رہا ہے یا جن کو اس کی اپنی زبان سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ اس کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں جن کا جائزہ لینے کی

ضرورت ہے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ کارپوریٹ یا تجارتی ادارے کسی بھی معاملے میں اس وقت تک ہاتھ نہیں ڈالتے جب تک کہ انھیں اس سے کسی قسم کے مالی فائدے کی امید نہ ہو۔ تجارتی گھرانے اپنے مفاد پر نظر رکھتے ہیں۔ اگر کسی سودے میں ان کو خسارے کے امکانات دکھائی دیں تو وہ اس کے قریب بھی نہیں جاتے۔ کئی سال قبل انڈیا ٹوڈے گروپ نے اپنے موقر رسالے ''انڈیا ٹوڈے'' کا اردو ایڈیشن نکالنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے ایک ڈمی پرچہ نکالا اور مختلف سطحوں پر سروے کروایا جس کے نتائج اس کے نزدیک حوصلہ بخش نہیں تھے اور اس نے اردو ایڈیشن نکالنے کا فیصلہ ترک کر دیا۔ جبکہ کچھ دوسرے اخبار نکالنے والوں کی نظر میں اقتصادی پہلو پر نہیں ہوتی۔ وہ دوسری نوعیت کی منفعت کو نگاہ میں رکھتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے اخبارات کی اشاعت کو نظریاتی نقطے سے دیکھتے ہیں تو کچھ لوگ سیاسی نقطہ نظر سے۔ سیاسی مقاصد کی حصولیابی کے لیے بہت سے اخبارات نکل رہے ہیں یا اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بڑے اخباروں کے مالکان اپنے اخباروں کے توسط سے سیاستدانوں کے ساتھ رشتے استوار کرنے یا حکومت واقتدار میں اپنے لوگوں کو فٹ کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کے مفادات کی تکمیل ہوتی رہے۔ اس کی ایک مثال ایک پرانے سیاسی اخبار سے دی جا سکتی ہے جس کا نام ہفت روزہ ''بلٹز'' تھا اور جو ممبئی سے انگریزی، ہندی اور اردو تین زبانوں میں نکلتا تھا۔ اس کے مالک آر کے کرنجیا اخبار کے لیے واحد پالیسی رکھتے تھے اور وہ پالیسی تھی اہل اقتدار کو خوش رکھنا۔

مشن نہیں اقتصادیات

اردو صحافت میں کارپوریٹ اداروں کی آمد اور اس پر ظاہر کیے جانے والے خدشات سے قطع نظر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بڑے تجارتی گھرانوں کے ذریعہ اردو اخبار نکالنے سے اردو صحافت کا فروغ ممکن ہوا ہے۔ اس کا اقتصادی پہلو بھی روشن اور واضح ہوا ہے۔ اردو صحافت کو اکثر مشن سے جوڑ کر دیکھا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اردو صحافت کا آغاز انگریزی حکومت سے ہندوستانیوں کو نجات دلانے کے مقصد سے ہوا تھا۔ بعد میں اس کا مشن اردو زبان کو زندہ رکھنا ہو گیا۔ لیکن اب تو اس کا اول اور آخر مشن ختم ہو گیا ہے یا پورا ہو گیا ہے اور جہاں تک دوسرے مشن کی

بات ہے تو جب کوئی غیر اردو ادارہ اردو اخبار نکالے گا تو اس کا مشن اردو زبان کا تحفظ نہیں ہوگا بلکہ تجارت ہوگا۔ وہ اپنے درپردہ مقاصد کی تکمیل کو ہی اپنا مشن بنائے گا اور اس کو پورا کرنے کے لیے اسے جو اقدامات کرنے ہوں گے وہ ضروری ہوں گے۔ سب سے پہلے تو اسے اپنے اخباروں کو معیاری بنانا ہوگا کہ قارئین دوسرے اخباروں کے مقابل رہتے ہوئے جانب راغب ہو سکیں۔ اس کے لیے اسے اپنی طباعت و اشاعت کا معیار بلند کرنا ہوگا اور اس میں شائع ہونے والے مواد کا معیار بھی اونچا کرنا ہوگا۔ روایتی اردو اخباروں کے مقابلے میں اپنے کارکنوں کو زیادہ مشاہرہ دینا ہوگا اور اس کے ساتھ ہی اخبار کو بہتر بنانے کے لیے بعض تقاضوں کو بھی پورا کرنا ہوگا۔ اخبار انقلاب تو پہلے سے ہی ایک اچھا اخبار رہا ہے۔ لیکن اب یہ اشاعت کے اعتبار سے بھی اور مواد کے اعتبار سے بھی۔ اسی طرح راشٹریہ سہارا بھی طباعت و اشاعت کے اعتبار سے اچھا اخبار ہے۔ ان اخباروں میں دوسرے روایتی اخباروں کے مقابلے میں کارکنوں کو بہتر مشاہرہ دیا جاتا ہے۔ کالم نگاروں کو بھی معقول معاوضہ مل جاتا ہے۔ جبکہ روایتی اردو اخباروں کے اداروں میں نہ تو بہتر مشاہرہ ملتا ہے اور نہ ہی مضمون نگاروں اور کالم نویسوں کو اعزازیہ دیتے ہیں۔ چھوٹے اردو اخباروں میں کام کرنے والے بیشتر صحافی اور کارکن اپنے اہل خانہ کی پرورش کے لیے چھپے چھپے دوسرے اداروں میں بھی کام کرتے ہیں۔ ان اداروں میں کسی معیاری زندگی گزارنے کی تو بات ہی کیا روزمرہ کی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہوتیں۔ روایتی اردو اخبار ہمیشہ مالی دشواری کی شکایت کرتے ہیں (یہ جان بوجھ کر کی جاتی ہے) ... اخبار پر کوئی خرچ نہیں ملتا۔

یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ غیر اردو ادارے اردو صحافت میں آ رہے ہیں۔ اس سے ... ہیں ... یہ ثابت ہے کہ اردو صحافت کا کاروبار بڑھ رہا ہے ... میں تجارت کے امکانات بڑھے ہیں۔ 2010-11 کی رجسٹرار کی رپورٹ کے مطابق اردو اخبارات تعداد کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ملک میں سب سے زیادہ ہندی کے روزنامہ اخبار شائع ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد 7910 ہے۔ اور ان کی مجموعی سرکولیشن 15,54,94,770 ہے۔ دوسرے نمبر پر انگریزی ہے جس کے روزنامہ اخباروں کی تعداد 1406 ہے اور ان کی مجموعی سرکولیشن 5,53,17,184

سب سے زیادہ اردو روزنامہ اخبارات تیسرے نمبر پر ہیں۔ ان کی تعداد 938 ہے اور ان کی مجموعی سرکولیشن دو کروڑ سولہ لاکھ انتالیس ہزار دو سو تیس (2,16,39,230) ہے۔ چوتھے نمبر پر گجراتی (761)، پانچویں نمبر پر تیلگو (603)، چھٹے نمبر پر مراٹھی (521) اور ساتویں پر بنگالی (472) ہیں۔ اردو اخباروں کی تعداد اشاعت کے تعلق سے مذکورہ صورت حال پرکشش بھی ہے اور حوصلہ افزا بھی۔ اردو صحافت میں غیر اردو داروں کی دلچسپی کی یہ بھی ایک وجہ ہو سکتی ہے۔

غیر اردو داروں کے اردو اخباروں کی اشاعت کے سلسلے میں جو سب سے بڑا خدشہ ظاہر کیا جاتا ہے وہ فرقہ پرستی ہے۔ بہت سی تنظیموں بشمول اردو اداروں کی جانب سے بھی یہ شبہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ ادارے ایک خفیہ سازش کے تحت اردو صحافت میں آ رہے ہیں تاکہ مسلمانوں پر فرقہ پرستی یلغار کی جا سکے۔ ان کا ماننا ہے کہ مسلمانوں پر ہندوتوا اور سخت گیر نظریات تھوپنے کے مقصد سے اردو زبان کے تئیں پیار کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ اس قسم کے اندیشے ظاہر کرنے والوں کا ماننا ہے کہ اردو اخباروں کے مسلم مالکان نے اردو کو رشتہ مذہب سے جوڑ رکھا ہے اور اسلامی تعلیمات کے فروغ میں بھی اخبار کا استعمال کرتے ہیں۔ چنانچہ اردو صحافت میں کارپوریٹ اداروں کے داخلے کو وہ غیر معمولی سمجھتے ہیں اور شبہ ظاہر کرتے ہیں کہ فرقہ پرست طاقتیں مسلمانوں کی ذہن سازی میں اردو اخباروں کے رول سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتی ہیں۔ ان کا یہ بھی ماننا ہے کہ اردو اخباروں کے غیر مسلم مالکان یہ قطعی نہیں چاہیں گے کہ ان کے ہاں سے اسلام کی تبلیغ ہو۔

اندیشہ ہائے دور دراز

لیکن کچھ لوگ اس اندیشے کو اندیشہ ہائے دور دراز قرار دیتے ہوئے مسترد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کارپوریٹ اداروں کا مقصد صرف مالی یا سیاسی فائدہ اٹھانا ہوتا ہے، مذہبی نہیں۔ جو غیر اردو یا غیر مسلم ادارے اردو کا رخ کرتے ہیں ان کا مقصد مسلمانوں کے جذبات مجروح کرنا نہیں بلکہ تجارتی فائدہ حاصل کرنا ہوتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ہفت روزہ عالمی سہارا، روزنامہ راشٹریہ سہارا کی مثال دیتے ہیں۔ جن کا ہندی ایڈیشن ہندوؤں کے حق میں ہوتا تھا

اور اردو ایڈیشن مسلمانوں کے حق میں آواز اٹھاتا تھا۔ اسی طرح راشٹریہ سہارا کے ہندی اور اردو ایڈیشنوں میں مواد اور پالیسی کے اعتبار سے بہت فرق ہے۔ فسادات اور دہشت گردی کے تعلق سے ہندی اخبار تقریباً اسی قسم کی رپورٹنگ کرتا ہے جیسی کہ دوسرے اخباروں کی ہوتی ہے جبکہ اردو سہارا نے ان دونوں ایشوز پر اور دوسرے ایشوز پر بھی بالکل الٹ پالیسی اختیار کی ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ بٹلہ ہاؤس انکاؤنٹر پر اس نے مسلمانوں کے حق میں تمام اردو اخباروں سے کہیں زیادہ زوردار آواز اٹھائی۔ فسادات کے تعلق سے بھی وہ مسلمانوں کی زبردست حمایت کرتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح غیر مسلم اداروں سے اسلام کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں ظاہر کیے جانے والے خدشات کا جہاں تک تعلق ہے تو غیر مسلم ملکیت والے اخباروں میں بھی اسلامی مضامین خوب شائع ہوتے ہیں بلکہ مسلم ملکیت والے اخباروں میں مسلکی تحفظات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے جبکہ ان اخباروں میں ایسا نہیں ہوتا۔ یہ اخبار تمام مسالک کی پسند اور ناپسند کو سامنے رکھ کر مضامین کا انتخاب کرتے ہیں۔ "انقلاب" کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ وہ بک گیا ہے۔ اس کی پالیسی مسلمانوں کی طرف اپنا جھکاؤ رکھتی ہے۔ ابھی تک کوئی ایسی چیز سامنے نہیں آئی ہے کہ نظریاتی یلغار کا شبہ کیا جا سکے۔ "انقلاب" کے ادارتی ذمہ داروں کا کہنا ہے کہ ان پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔ ان کو کام کرنے اور مواد و مضامین کے انتخاب کی پوری آزادی حاصل ہے۔ "انقلاب" میں جمعہ کے روز دو صفحات مذہبی مضامین کے لیے مختص ہوتے ہیں۔ "دینک جاگرن" کے ہاتھ میں آنے سے قبل اس کا جو انداز تھا وہ اب بھی جوں کا توں برقرار ہے۔ "انقلاب" اور "راشٹریہ سہارا" میں اور غیر مسلم ملکیت والے ایک اردو ہفت روزہ "چوتھی دنیا" میں جس طرح مذہبی مضامین دیے جاتے ہیں اور مذہبی تقریبات کی رپورٹیں شائع ہوتی ہیں ویسی مسلم ملکیت والے اخباروں میں بھی شائع نہیں ہوتیں۔ "ای ٹی وی اردو"، "زی سلام" اور "عالمی سہارا" جیسے ٹی وی چینلوں کی مثال بھی دی جا سکتی ہے۔ یہ اگرچہ غیر مسلم ملکیت والے چینل ہیں لیکن ان پر ایسے پروگرام بالکل نہیں آتے جن کو دیکھ کر نظریاتی یلغار کا خطرہ محسوس کیا جا سکے۔ پندرہ روزہ "دی سنڈے انڈین" کی بھی مثال دی جا سکتی ہے جو اردو سمیت چودہ زبانوں میں شائع ہوتا ہے۔ اس کا اردو ایڈیشن پانچ سال سے نکل رہا ہے۔ لیکن مذکورہ اخبارات ابھی تک نظریاتی یا

حقہ مدی خرابی پیدا نہیں کرتے ہیں۔ ان اخباروں میں وہی چیزیں شائع کی جاتی ہیں جو مسلمان پڑھنا چاہتے ہیں۔ جب تک ان کا رجحان مسلم نواز رہے گا مسلمان ان کو پڑھتے رہیں گے اور جس دن انھوں نے ہندو نوازی یا مسلم مخالفت کی پالیسی اپنائی مسلمان انھیں خریدنا بند کر دیں گے۔ 'پرتاپ' اور 'ملاپ' کی مثال سامنے ہے۔ مسلمان انھیں اسی لیے نہیں پڑھتے کہ ان کی پالیسی مسلم مخالفت کے محور پر گردش کرتی ہے۔

کچھ لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اردو سے نابلد اور ناواقف لوگ اردو کے اخبار کیسے نکال سکتے ہیں۔ یہ کوئی معقول حجت نہیں ہے۔ اسے تو ''[illegible]'' کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جو مسلمان اردو کے اخبار نکالتے ہیں ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو اچھی اردو جانتے ہوں یا جو اردو زبان پر عبور رکھتے ہوں۔ 90 کی دہائی میں ایک اردو ہفت روزہ اخبار دہلی سے جاری ہوا تھا جو روزنامہ سائز پر فور کلر میں نکلتا تھا اور جس کی اشاعت صدام حسین کی جذباتی حمایت کی وجہ سے ایک لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن اس کے مالکان اور مدیر اردو سے نابلد تھے۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ایک بہت پرانا ادبی ماہنامہ 'بیسویں صدی' نکلتا تھا۔ اس کے مالک اور ایڈیٹر خوشتر گرامی تھے۔ یہ ان کا قلمی نام تھا۔ ان کا اصل نام رام رکھا مل چڈھا تھا۔ وہ اردو نہیں جانتے تھے۔ لیکن ان کے نام سے ایک مقبول مستقل کالم 'تیر و نشتر' چھپتا تھا جسے کبھی ناز انصاری تو کبھی عبدالباقی اور کبھی کوئی اور لکھتا تھا۔ 'بیسویں صدی' نے کتنے ہی ادیبوں اور شاعروں کی ایک کھیپ پیدا کی جنھوں نے اردو ادب و شاعری میں نام کمایا اور ادب کی خدمت کی۔ (بیسویں صدی کو بعد میں رحمن نیر نے خرید لیا تھا اور کچھ دنوں بند ہو گیا۔ اب دوبارہ ان کی اہلیہ شمع افروز زیدی اسے نکال رہی ہیں)۔

مختلف آراء کے نتائج

راقم الحروف نے اس موضوع پر متعدد لوگوں اور اردو اور ہندی کے کئی صحافیوں سے بات کی تو یہ نتیجہ نکلا کہ قارئین کا ایک طبقہ اسے اردو کے حوالے سے مستحسن قدم کے طور پر دیکھ رہا ہے، جبکہ چھوٹی تنظیمیں اور بعض چھوٹے اخبارات اپنے تحفظات کا اظہار کر رہے ہیں۔ کئی لوگوں نے

اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ اردو صحافت میں کارپوریٹ اداروں کی آمد سے اردو کے چھوٹے اخباروں میں اضطراب کی زیریں لہریں دوڑ گئی ہیں۔ ان کے مدیروں کے خیال میں اردو صحافت میں غیر اردو اداروں کی آمد اردو صحافت کے لیے خطرناک ہے۔ کئی چھوٹے اخباروں کے مدیروں نے اس صورت حال پر اپنی فکرمندی اور تشویش ظاہر کی ہے۔ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر یہ سلسلہ مزید آگے بڑھا تو اس سے ان کو نقصان ہوگا۔ ایسے ہی ایک اخبار کے مدیر نے راقم السطور سے گفتگو میں یہ خدشہ ظاہر کیا کہ اگر (ایڈیٹروں اور رپورٹروں) کو زیادہ پیسہ دیا جائے گا تو ان کے دل سے صحافت کا درد ختم ہو جائے گا۔ بہت غور و خوض کے بعد راقم اس نتیجے پر پہنچا کہ دراصل وہ ملت کے درد میں آ کر اپنا اخبار نکال رہے تھے۔ چونکہ روایتی اخباری خاندانوں سے تعلق رکھنے والوں نے بھی اس تشویش کا اظہار کیا ہے کہ یہ صورت حال چھوٹے اخباروں کے لیے نقصان دہ ہے۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ "گواہ" نے اپنے ایک مضمون میں اردو اخباروں کے مسلم مالکان کی توجہ چھوٹے اخباروں کو تحفظ دینے کی جانب مبذول کرانے کی کوشش کی ہے اور کہا ہے کہ جب آپ اپنے صحافیوں کو مناسب مشاہرہ نہیں دیں گے تو وہ بدرجہ مجبوری اپنی روزی کا ذریعہ تلاش کریں گے۔ اس ہفت روزہ کے مدیر سید فضل حسین پرویز لکھتے ہیں "اردو صحافیوں کی اکثریت تو معاشی طور پر کمزور ہے۔ یہ اپنی معاشی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرتی ہے۔ ورنہ ایک حقانی صحافت کی خدمت تو کرتا ہے مگر اپنے اہل و عیال کا پیٹ نہیں بھر سکتا۔ اگر یہی صورت حال رہی تو مسلم تنظیموں سے متعلق اداروں کو نقصان ہونا پڑے گا۔ اس سے پہلے ہی انھیں چاہیے کہ وہ اپنا بوجھ ... کی دوری شکایت ... کرنے کی کوشش کریں۔ اگر ادارے اپنے ملازمین کی ضرورت کے مطابق معاوضہ دیں تو سب ایمانداری سے اپنے اداروں سے وابستہ رہیں گے۔ اردو اخباروں کے مالکان اپنے صحافیوں کو مناسب مشاہرہ دیں تو اردو صحافت کا معیار بھی بلند ہو سکتا ہے۔" اردو اخباروں کے مسلم مالکان سید فضل حسین پرویز کے مشورے پر عمل کرتے ہیں یا نہیں، کاش اس سلسلے میں وہ پہل کریں گے۔

اردو صحافت میں کارپوریٹ سیکٹر کے داخلے کو وسیع تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔ دنیا میں تبدیلیوں کا عمل جاری رہتا ہے۔ جو لوگ تبدیلی سے گھبراتے ہیں وہ زمانے سے پچھڑ

جاتے ہیں۔ موجودہ ترقی کے دور میں کچھ پچھڑ بھی جاتے ہیں اور کچل بھی جاتے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب نے بہت سے معاملات کی تشکیل نو کی ہے۔ بہت سے فرسودہ نظریات متروک ہو چکے ہیں اور بہت سے نئے نظریات نے ان کی جگہ لے لی ہے۔ اس سلسلے میں شعبۂ صحافت سے بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جو تبدیلی آرہی ہے اس کا کچھ اندازہ اس سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جس طرح فرسودہ کاغذوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے اسی طرح شاید چھوٹے اخبارات بھی Reflection سے دور ہو رہے ہیں۔ اب شاید یہ ان کا بھی [illegible] اخبارات کا دور [illegible] ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ چھوٹے اخبارات صفحۂ ہستی سے بالکل ہی ناپید ہو جائیں گے۔ [illegible] ترقی [illegible] میں [illegible] اور [illegible] شہر یا قصبے کی خبریں [illegible] اس فرق میں چھوٹے اخبارات کا حصہ رہتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ جو مضافاتی بازار، گلی محلے کی چھوٹی چھوٹی خبریں ہوتی ہیں [illegible] ہوتی ہیں۔ [illegible] پسند [illegible] سے خریدے جاتے۔ [illegible] طرح [illegible] سے نکلنے والے اخبار [illegible] اور [illegible] ہیں [illegible] کا [illegible] خبروں سے [illegible] کا عقیدہ خراب ہو چکا ہے [illegible] اور ان کا بیان [illegible] ہے کہ چند خبریں [illegible] ہیں۔ [illegible] تبدیلی [illegible] سے ان کے اثرات کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔

صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ

اردو صحافیوں کی تربیت کی ضرورت وقتاً فوقتاً محسوس ہوتی رہتی ہے اور اس سلسلے میں متعدد تجاویز بھی سامنے آتی رہتی ہیں۔ لیکن اس جانب ابھی تک کوئی ٹھوس عملی قدم نہیں اٹھایا جا سکا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی زبان کی صحافت کو زبان و بیان کی باریکیوں اور صحافتی اصولوں کے حوالے سے معیاری بنانے کے لئے صحافیوں کی تربیت بہت ضروری ہوتی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں صحافتی کورسوں کا آغاز اس مقصد سے کیا گیا ہے اور آج الیکٹرانک میڈیا کے انقلاب نے بڑی تعداد میں طلبہ کو ان کورسوں میں داخلہ لینے کی ترغیب و تحریک دی ہے۔ یونیورسٹیوں کے اردو شعبوں میں بھی صحافت کا کورس پڑھایا جاتا ہے۔ تاہم عملی ٹریننگ کا کوئی بندوبست اردو میڈیا میں ابھی تک نہیں ہو سکا ہے۔ البتہ اب اس جانب قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ایک تربیتی پروگرام کی ایک خوش آئند پہل کی ہے۔ اردو کونسل کے دفتر میں اردو صحافیوں کی ٹریننگ کا آغاز کیا گیا ہے۔

اردو صحافیوں کی ٹریننگ میں اردو الفاظ کے صحیح استعمال اور اردو کے فروغ، صحیح اردو لکھنے، ترجمے کی تکنیک، انگریزی زبان کی اہمیت، نیوز سینس، اخباروں میں کیسی اردو لکھی جائے اور اردو صحافیوں کو جدید مواصلاتی تکنالوجی سے ہم آہنگ کرنے جیسے امور پر ماہرین کے خیالات اور ان سے استفادہ کا موقع دینے کا منصوبہ بنایا گیا ہے۔

آج اردو صحافیوں کو بھی جدید مواصلاتی تکنالوجی سے لیس کرنے کی ضرورت ہے۔ فی زمانہ وہی صحافی کامیاب رہتا ہے جو نئی تکنالوجی سے نہ صرف واقف ہو بلکہ اس کے استعمال کی بھی اہلیت رکھتا ہو۔ کمپیوٹر، انٹرنیٹ اور ویب کی سہولتیں آج کے دور میں بہت ضروری ہیں۔ مستقبل کی صحافت میں

ویب کو بڑی اہمیت حاصل ہونے والی ہے۔ دنیا بھر میں ویب میگزین اور ویب اخبار نکلنے شروع ہو گئے ہیں اور جو صحافی خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہو اگر ان جدید تقاضوں سے لاعلم ہوگا، وہ رفتارِ زمانہ کا ساتھ نہیں دے سکے گا اور مقابلے کے اس دور میں راستے ہی میں گر کر دم توڑ دے گا۔ آج انہی امیدواروں کو ترجیح دی جاتی ہے جو ان چیزوں کا علم رکھتے ہوں۔ بڑے اخباروں میں صحافیوں کے سلیکشن کے وقت سب سے پہلے یہی بات دیکھی جاتی ہے اور اب تو انٹرنیشنل سطح کے اردو رسالوں یا اخباروں میں بھی ایسے ہی امیدواروں کا انتخاب کیا جاتا ہے جو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا علم رکھتے ہوں اور قلم کاغذ کے بجائے لیپ ٹاپ اور ڈیسک ٹاپ پر کام کرنے کی صلاحیت کے مالک ہوں۔ پرانی نسل کے صحافیوں میں خاص طور سے یہ خوبی آپ تلاش کریں گے تو نہیں ملے گی۔ لیکن موجودہ دور کا اردو صحافی یا نوجوان صحافی اس فن سے واقف ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اب قلم کاغذ سے کام لے کر اور فیکس کر کے خبر نہیں بھیجی جا سکتی۔ اس لیے وہ ای میل کو ترجیح دیتا ہے۔ تاہم اردو کے تمام صحافی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا علم نہیں رکھتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو کے تمام صحافیوں اور بالخصوص نوواردانِ صحافت کو کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے علم سے باخبر اور واقف کرایا جائے تاکہ وہ بھی زمانے کے قدم سے قدم ملا کر چلنے کے اہل بن سکیں۔ صحافیوں کی اس پچھلی نسل کو بھی جو اب بھی اخباروں میں کام کر رہی ہے، اس کی تربیت کی ضرورت ہے۔

خبر سازی کا سلیقہ

خبر نویسی کا سلیقہ بھی بہت ضروری ہے۔ جو نوجوان اس وقت اردو صحافت میں قدم رکھ رہے ہیں ان میں سے زیادہ تر اگرچہ کمپیوٹر پر کام کرنا جانتے ہیں لیکن وہ زبان کے حوالے سے کمزور ہیں۔ انھیں اس بات کی تربیت دی جانی چاہیے کہ خبر کیسے بنائی جائے، کن باتوں کا خیال رکھا جائے، کس چیز سے شروعات کی جائے، کس بات کو انٹرو میں پیش کیا جائے، کس بات کی تفصیل میں جایا جائے اور کس کی تفصیل میں جانے سے گریز کیا جائے، کوئی چٹ پٹی بات کیسے کی جائے اور غیر ضروری الفاظ اور جملوں کے استعمال سے کیسے بچا جائے۔ دراصل خبر اس انداز سے بنائی جانی چاہیے کہ وہ مضمون یا اداریہ نہ ہو کر صرف خبر رہے۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ قاری پوری خبر پڑھ جاتا ہے

جن سے اردو خبر میں جیسی تاثیر نہیں آتی۔ چونکہ خبر کا اہم جز سرخی بنتا ہے اور اخبار ی میں وہ بہت احتیاط سے بنائی جانی چاہیے۔ اس کے بعد متن کی تفصیلات میں جانا چاہیے۔ بعض حضرات خبر کے آخری حصے کو پہلی سرخی بناتے ہیں اور بعض تو [illegible] یا افسانوی [illegible] کرتے ہیں خبر نگاری [illegible] خبروں کو [illegible] کرتے وقت اس بات کا خیال رکھا جانا چاہیے کہ خبر کی زبان بھی [illegible] ذاتیں [illegible] اداریے بھی ہونا چاہیے [illegible] پر خبر [illegible] ہونا چاہیے۔ [illegible] کے بارے میں بہت سی کتابیں ہمارے پیش رو [illegible] کے آغاز سے قبل ایک امیدوار کا انتخاب [illegible] ترجمہ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ اردو اخبار [illegible] ضرورت ہوتی ہے جو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کر سکے اور [illegible] سے واقف [illegible] ترجمہ نہیں کر سکتے [illegible] نہیں [illegible] بھی ضروری ہیں [illegible] ساتھ [illegible] جس سے اور جس میں [illegible] ہوتا ہے۔ کوئی ضروری [illegible] ترجمہ کر سکے۔ لیکن کم از کم [illegible] چاہیے۔

[illegible] سے اردو اخباروں کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ کم از کم چھوٹے اخباروں [illegible] رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [illegible] چھوٹے [illegible] ہم میں ایک بات بہت صفائی سے کہنا چاہتا ہوں۔ [illegible] سے بہت سے فائدے ہیں اور اسے اردو صحافت میں ایک

انقلاب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، وہیں اس کے کچھ نقصانات بھی ہیں۔ جن اخباروں میں کارکنوں کی کمی ہے ان میں خبر کو بغیر پڑھے دے دیا جاتا ہے اور جن اخباروں میں کارکن تو ہیں مگر اسپیس کی قلت ہے وہاں سیٹنگ کی جاتی ہے اور سیٹنگ کے دوران بعض اوقات خبر بے ترتیب ہو جاتی ہیں، کچھ باتیں بغیر سیاق و سباق کے آ جاتی ہیں اور اگر زبان و بیان کی کوئی غلطی اس خبر میں ہے تو وہ بھی جوں کی توں در آتی ہے۔ یو این آئی انگریزی کی جو خبر ہوگی وہ اس کی پالیسی اور مزاج کے مطابق ہوگی۔ ہمارے اردو اخبارات جوں کا توں لے کر چھاپ دیتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ان کی پالیسی اور مزاج کے برعکس بھی خبریں چھپ جاتی ہیں۔ اسی طرح یو این آئی اردو کا مترجم جو زبان استعمال کرتا ہے ہمارے یہاں بھی جوں کا توں چھاپ دیتے ہیں جس کی وجہ سے زبان و بیان میں جو تنوع ہونا چاہیے وہ کم از کم ان خبروں کی وجہ سے پیدا نہیں ہو پاتا۔ یہ بات میں دہلی کے اخباروں کے تناظر میں کہہ رہا ہوں۔ البتہ جنوب کے اردو اخباروں میں اس طرح آنکھ بند کرکے خبریں نہیں دی جاتیں۔

عملی تربیت کی ضرورت

جہاں تک اردو صحافیوں کی تربیت کا مسئلہ ہے تو یہ تربیت عملی میدان میں ہونی چاہیے اور اخبار کا عملی میدان اس کا دفتر ہوتا ہے۔ دفتر میں بیٹھ کر کام کرنے سے ہی سیکھا جا سکتا ہے۔ اخبارات جگہ جگہ اپنے اسٹرنگر رکھ لیتے ہیں اور ان کی بھیجی ہوئی خبروں کو ادارتی میز پر ہی چھاپ دیتے ہیں۔ حالانکہ ایک رپورٹر کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ چند ماہ تک دفتر میں ڈیسک پر کام کرے کیونکہ بہت سی ایسی باتیں جو وہ فیلڈ میں نہیں سیکھ سکتا، ڈیسک پر اپنے سینئر ساتھیوں کے ساتھ کام کرکے سیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے اخباروں میں رپورٹروں سے پہلے ڈیسک پر کام کرایا جاتا ہے تاکہ ان کو اخبار نویسی یا خبر نگاری کا سلیقہ آ جائے۔ اس کے بعد انھیں فیلڈ میں بھیجا جاتا ہے۔ اس لیے تربیت اخبار کے دفتر میں ہونی چاہیے۔ تربیتی مراکز میں ایک صحافی جو کچھ سیکھتا ہے اسے اخبار کے دفتر میں برتے اور استعمال کرے۔ کیونکہ تجربات آدمی کو بہت کچھ سکھاتے ہیں۔ اگر ایسی بات نہ ہوتی تو مجھ جیسے جانے کتنے صحافی جنھوں نے صحافت کا کوئی کورس نہیں کیا ہے صحافت کو پیشہ اور ذریعہ

مقام بنانے میں کامیاب نہ ہو پاتے۔ اور ذرا پیچھے جا کر دیکھیں تو اردو کے جو جید صحافی گزرے ہیں اور جنھوں نے اخبار نویسی پر کتابیں بھی تحریر کی ہیں کیا انھوں نے صحافت کا کوئی کورس کیا تھا؟ انھوں نے اخبار کے دفتر میں بیٹھ کر صحافتی اہلیت وصلاحیت حاصل کی اور آگے چل کر صحافت کی آبرو بنے۔ اس سے متعلق سوال یہ ہے کہ اخباروں کے دفتروں میں نوآموز صحافیوں کو ٹریننگ کون دے گا۔ کیا وہ لوگ اس کے اہل ثابت ہوں گے جن کو خود ٹریننگ کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں زبان وادب اور صحافت کے ماہرین کی خدمات حاصل کرنی ہوں گی۔

اس پر اکثر بحث ہوتی ہے کہ روزنامہ اخبار کی زبان کیسی ہونی چاہیے۔ ایک بڑا حلقہ ایسا ہے اور یہ حلقہ ہمیشہ رہا ہے جو اس بات پر زور دیتا ہے کہ اخبار کی زبان سادہ، عام فہم اور سلیس ہونی چاہیے۔ کیونکہ روزنامہ اخباروں میں خبر ہوتی ہے ادب نہیں۔ وہ ادب تخلیق کرنے کے بجائے قارئین تک پل اور لوگوں کی بات پہنچاتا ہے اور دنیا میں ہونے والے واقعات سے باخبر کرتا ہے۔ یہ بات بالکل درست ہے۔ اخبار کی زبان سادہ، سلیس اور عام فہم ہونی چاہیے۔ اگر ہم ادق اور بوجھل زبان استعمال کریں گے تو ترسیل کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ لیکن بڑے ادب کے ساتھ میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ اردو زبان کی عمومیت کا ضرور خیال رکھا جانا چاہیے لیکن ایسا نہ ہو کہ عمومیت کی کوشش میں زبان کی خصوصیات کا تیا پانچہ ہو جائے۔ بہت افسوس اور کرب کے ساتھ یہ بات کہنی پڑتی ہے کہ آج متعدد اخباروں میں زبان کا بڑا زوال ہو رہا ہے۔ عمومیت کو برقرار رکھنے کی کوشش میں تذکیر وتانیث تک پر دھیان نہیں دیا جاتا اور املا کی بھی بڑی غلطیاں کی جا رہی ہیں۔ زبان وبیان کی دوسری خرابیوں کو جانے دیجیے املا اور تذکیر وتانیث کا حلیہ بگڑ کر رہ گیا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ جو اخبار جتنا بڑا ہے اس میں یہ غلطیاں اتنی ہی زیادہ ہیں۔ بعض اردو اخباروں میں زبان کا قتل ہوتے دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔ عام فہم اور سلیس زبان بڑے صحافت مولانا محمد عثمان فارقلیط بھی لکھا کرتے تھے جن کا اداریہ پڑھنے کے لیے قارئین بے چین رہتے تھے۔ لیکن وہ عمومیت کے ساتھ ساتھ خصوصیات کو بھی برقرار رکھتے تھے۔ ایک بار ان کے ایک ہم عصر نے جو کہ اردو زبان کے بڑے عالم تھے، ان سے کہا کہ آپ نے بھی ہوٹلوں اور رکشے والوں کی زبان لکھنی شروع کر دی ہے۔ مولانا فارقلیط نے کہا کہ میرا اخبار جو لوگ پڑھتے ہیں میں انھی کی زبان استعمال کروں گا کیونکہ مجھے انھی کو اپنی بات سمجھانی

ہے اور پھر اردو ایک تغیر پذیر زبان ہے۔ لیکن اس کے باوجود میں غلط اردو نہیں لکھ رہا اور زبان و بیان کا بھی خاص خیال رکھتا ہوں۔

اس کے ساتھ میں یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ جب تک ہم دوسری زبان کے الفاظ کو اپنی زبان میں شامل نہیں کریں گے زبان کا دامن وسیع نہیں ہوگا اور زبان کنویں کا مینڈک بن کر رہ جائے گی۔ ہمیں جہاں اپنی زبان کی خوبیوں اور خصوصیتوں کے تحفظ کی ضرورت ہے وہیں دوسری زبان کے عام بول چال کے الفاظ کو قبول کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ تبھی ہم زبان کے حوالے سے آگے بڑھ پائیں گے۔ ایک زمانہ تھا جب سلامت علی مہدی، مہدی نظمی، ممتاز انصاری اور دوسرے جید صحافی ایک وقت کی نئی خبریں بناتے اور کاتبوں کو دیتے جاتے تھے۔ کبھی کسی کاتب نے پوچھا کہ تم نے آخری جملہ کون سا لکھا اور تم نے کس بات پر اپنا قلم روک دیا اور پھر وہیں سے خبر آگے بڑھاتے لیکن مجال ہے کہ زبان و بیان کی کوئی غلطی ہو جائے۔ آج نہ تو مولانا فارقلیط ہیں نہ سلامت علی مہدی، نہ ممتاز انصاری ہیں اور نہ ہی مہدی نظمی اور سچی بات یہ ہے کہ آج وہ اردو قارئین بھی نہیں رہے جو ان کو میسر تھے۔ آج اردو زبان پر زوال آگیا ہے اور اردو کے مدرسے بھی اس زبان سے ناطہ توڑتے جا رہے ہیں۔ لیکن کیا اس وجہ سے ہم غلط اردو لکھیں اور جو لوگ صحیح اردو نہیں جانتے یا نہیں سمجھ سکتے ان تک صحیح اردو نہ پہنچائیں۔ یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اس زوال پذیر دور میں اردو کو زندہ رکھنے کی کوشش کریں اور اس بارے میں اردو اخباروں پر تو خاص ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

ہمعصر اردو صحافت کے تقاضے

کہا جاتا ہے کہ زندہ زبانیں روزگار کی بنیاد پر نہیں بلکہ جذبہ کی بنیاد پر باقی رہتی ہیں اور ان کی شریانوں میں اقتصادیات و معاشیات کے لہو کے بجائے جوش اور جنون حرارت بن کر گردش کرتے ہیں۔ یہ موضوع الگ بحث کا متقاضی ہے کہ اگر زبان روزگار فراہم نہ کر سکے تو کیا ہم اس سے پناہ طلب کرتے ہیں اور اسے اپنی زندگی اور اپنے شب و روز سے خارج کر دیں۔ یہ بات سچ ہے کہ آزادی کے بعد مختلف وجوہات سے اردو اور روزگار کا باہمی رشتہ بتدریج کمزور ہوا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ اردو اخبارات و رسائل کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوا ہے۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تقسیم ہند کے وقت متحدہ ہندوستان میں اردو اخباروں کی تعداد 415 تھی جو تقسیم کے بعد گھٹ کر 345 رہ گئی تھی۔ لیکن آزاد ہندوستان میں اردو اخباروں کی تعداد تیزی سے بڑھی ہے۔ اس وقت ملک کے مختلف حصوں سے کثیر تعداد میں اردو روزنامے شائع ہو رہے ہیں۔ ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامے اور دو ماہی، سہ ماہی اور ششماہی رسائل و جرائد بھی بڑی تعداد میں شائع ہو رہے ہیں۔ حکومت کی حوصلہ افزائی کی پالیسی اور اشتہارات کی شکل میں سرکاری امداد کے نتیجے میں بھی ان کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ ادھر حالیہ برسوں میں کچھ ایسی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں جو بے حد خوش آئند اور حوصلہ بخش ہیں۔ مثال کے طور پر پہلے تجارتی ادارے یا دوسری زبانوں کے بڑے صنعتی ادارے اردو میڈیا اور اردو اخباروں کی طرف نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی باعث گناہ سمجھتے تھے لیکن اب یہ ذہنیت بدل رہی ہے اور وہ بھی اردو صحافت میں داخل ہو رہے ہیں اور اردو اخبار شائع کرنے والے قافلے میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ اردو الیکٹرانک میڈیا میں بھی ان کا داخلہ ہوا ہے۔ گو کہ وہ بھی نسبتاً پیچھے ہیں لیکن قافلے کے ساتھ ہیں۔ اس کے اسباب جو بھی ہوں لیکن یہ

صورت حال براہ راست اردو صحافت کے لیے مفید اور خوش آئند ہے۔

اگر ہم اردو اخباروں کے مواد کی بات کریں تو اشتہاروں پر بھی نظر ڈالنی ہوگی۔ اخباروں سے وابستہ ایک بہت بڑا حلقہ ایسا ہے جو کہتا ہے کہ اشتہارات اخباروں کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور سرمائے کے بغیر کوئی بھی اخبار زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ بات بالکل درست ہے اور اسی لیے وہ معیار یا سرکولیشن کے بجائے سرمائے کی فراہمی پر زیادہ زور دیتا ہے۔ یہ بھی درست ہے کہ سرمائے کے بغیر کوئی اخبار نہیں نکل سکتا۔ لیکن اس سے بھی بڑی اور ناقابل تردید سچائی یہ ہے کہ قاری اخبار کی روح ہوتا ہے۔ اخبار اگر جسم ہے تو قاری اس کا دل اور زبان ہے اس کی وجہ نہ محبت اس دل کی دھڑکن ہے۔ کسی اخبار کے لیے سرمائے کی بے انتہا فراوانی ہو لیکن اس کے پاس قارئین نہ ہوں تو وہ اخبار زندہ لاش کی مانند ہے۔ آج اردو اخبار بڑی حد تک تو نہیں لیکن کسی حد تک جاں نثاروں اور اپنی زبان کے لیے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دینے کا جذبہ رکھنے والے قارئین سے خالی ہوتے جا رہے ہیں۔ اخباروں کے ٹائٹل ضرور بڑھ رہے ہیں اور ان کی چمک دمک میں بھی اضافہ ہو رہا ہے لیکن ان کے قارئین کا حلقہ دن بہ دن سکڑتا جا رہا ہے۔ وہ علاقے جو اردو کے گہوارہ مانے جاتے تھے آج ہندی کی طرف کوچ کرنے لگے ہیں اور بیشتر اردو علاقوں میں اردو والے بھی ہندی اور انگریزی اخباروں کو اردو اخباروں پر ترجیح دینے لگے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ مسلمان اور اردو خواں افراد جو دانشور ہونے کے زعم میں جیتے ہیں، اردو اخبار خریدنے اور پڑھنے کو باعث شرم سمجھتے ہیں۔ ہاں وہ اس حد تک دلچسپی ضرور رکھتے ہیں کہ ان اخباروں میں ان کی نگارشات یا ان کے بیانات شائع ہوتے رہیں اور انھیں اعزازی طور پر اخبار دستیاب ہوتا رہے۔ یہ صورت حال اردو صحافت پر منفی انداز میں اثر انداز ہوتی ہے اور اردو اخباروں کے قارئین کا دائرہ تنگ کرنے میں معاون ثابت ہو رہی ہے۔

اگر ہم اخباروں کے مواد، خبروں، تجزیاتی رپورٹوں اور مضامین کے انتخاب اور ان کی پیشکش کا جائزہ لیں تو اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ اس وقت جو اخبارات شائع ہو رہے ہیں ان میں معیاری بھی ہیں اور غیر معیاری بھی۔ غیر معیاری اخباروں کی تعداد زیادہ ہے۔ تاہم ہر بڑے شہر میں کوئی نہ کوئی معیاری اخبار بھی موجود ہے۔ یہ اخبارات اپنی خبروں، اداریوں، تجزیاتی رپورٹوں اور

نداز پیشکش کے اعتبار سے انگریزی اور ہندی کے قومی اور مین اسٹریم اخباروں سے کسی بھی طرح کم نہیں۔ پھر بھی اس سلسلے میں افسوسناک امر یہ ہے کہ شمالی ہند کا دامن، جو اردو زبان کا مرکز ہوا کرتا تھا، معیاری اخباروں سے بتدریج خالی ہوتا جا رہا ہے اور جنوبی ہند اس پر بازی لیتا جا رہا ہے۔ وہاں سے نسبتاً زیادہ بہتر اور معیاری اخبار شائع ہو رہے ہیں۔ اگر ہم دارالحکومت دہلی اور بعض دیگر شہروں کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ بعض اخباروں نے سطحیت کا اس قدر مظاہرہ کیا ہے کہ جینوئن صحافیوں کو ندامت سے اپنا منھ چھپانا پڑتا ہے۔ کئی اقسام کی بداطواریاں ان میں در آئی ہیں اور انھیں کاسہ لیسی سے لے کر اہل دولت و ثروت کے آستانوں پر حاضری دینے میں بھی کوئی عار نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اندر مسلکی اختلافات کے وقت وہ غیر جانبدار نہیں رہ پاتے، وہ بھی مفادات حاصلہ کے تحت مسلکی وابستگیوں کے شکار ہو جاتے ہیں اور کسی ایک گروپ کی اندھی حمایت کرنے لگتے ہیں کہ ان پر فریق بن جانے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اس صورت حال نے صحافت کے معیار کو بھی متاثر کیا ہے اور قارئین کو ان سے برگشتہ بھی کر دیا ہے۔ تاہم ان برائیوں کے اور تمام منفی حالات میں بھی ایسے اخبار اور صحافی موجود ہیں جو گندم نما جو فروشوں کی بھیڑ میں اپنی الگ اور منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ جب تک ایسے حق پسند اور دیانتدار صحافی موجود ہیں مذکورہ بالا منفی رجحانات سے صحافت کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔

صحافیوں کا فرض منصبی

صحافیوں کا فرض منصبی جہاں ملکی حالات و واقعات، معاشی اتار چڑھاؤ، سیاسی اتھل پتھل اور سماجی تبدیلیوں کا دیانت داری، بے باکی اور گہرائی کے ساتھ تجزیہ کرکے مثبت نتائج اخذ کرنا ہے، وہیں اپنے قارئین کو گمراہ ہونے اور سماج دشمن افراد اور ان طاقتوں کے ہاتھوں آلۂ کار بننے سے بچانا، ان کی رہنمائی کرنا اور انھیں سیدھی اور سچی راہ دکھانا بھی ہے۔ ایک صحافی اس کسوٹی پر اسی وقت کھرا اتر سکتا ہے جب وہ ہر قسم کی طمع سے بے نیاز ہو کر دیانت داری اور بے باکی و بے خوفی کے ساتھ اپنا فرض ادا کرے۔ اگر اس کے ضمیر کے ترازو میں لالچ کا پلڑا بھاری ہو گیا تو وہ انصاف سے کام نہیں لے سکے گا اور اعلیٰ صحافتی قدروں کو پامال کرنے سے بھی گریز نہیں کرے گا۔

ایک صحافی کو تمام قسم کی سیاسی، سماجی، طبقاتی اور گروہی وابستگی سے اوپر اٹھ کر کام کرنا چاہیے۔ اگر اس نے خود کو ان وابستگیوں سے آزاد نہیں کیا تو وہ حقیقی صحافی ہونے کا فریضہ سرانجام نہیں دے سکتا اور اس کا قلم خود کو نیلام ہونے سے بھی نہیں روک سکتا۔ موجودہ صورت حال یہ ہے کہ اب صحافت مشنری جذبے سے خالی ہو گئی ہے اور خالص تجارتی اہداف کو سامنے رکھ کر آگے بڑھ رہی ہے۔

راقم الحروف صحافت کے طویل مطالعے، اپنے ذاتی تجربے، پیشہ ورانہ مقابلے میں تیزی اور میڈیا میں آئی بے پناہ تبدیلیوں کی روشنی میں یہ بات کہتا رہا ہے کہ اب صرف مشن سے بات نہیں بنے گی بلکہ صحافت کو تجارتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا ہوگا اور اسے خود کو ضروریات زمانہ کے مطابق ڈھالنا ہوگا۔ لیکن اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ تجارتی تقاضوں کی تکمیل کا مطلب صحافتی اصولوں کو خیرباد کہہ دینا نہیں ہے۔ صحافتی قدروں کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے، ان کا احترام کرتے ہوئے اور ان کی پابندی کرتے ہوئے بھی تجارتی مقاصد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ اگر قدروں کو پامال کر کے اور اصولوں کا گلا گھونٹ کر اخبار نویسی کی جائے تو وہ خواہ کچھ بھی ہو صحافت نہیں ہو سکتی۔ موجودہ الیکٹرانک میڈیا میں اس وقت جو خطرناک رجحانات پرورش پا رہے ہیں وہ صحافتی اصولوں کا گلا گھونٹنے کا سبب بن رہے ہیں۔ بے انتہا خوبیوں سے مزین ہونے کے باوجود الیکٹرانک میڈیا میں مختلف قسم کی خامیاں اور خرابیاں بھی داخل ہو گئی ہیں اور وہ خرابیاں پرنٹ میڈیا یا مطبوعہ صحافت میں بھی در آئی ہیں۔ چونکہ اردو صحافت بھی مین اسٹریم میں شامل ہے اس لیے وہ بھی اس سے اچھوتی نہیں ہے۔ اس وقت پورے ملک میں بدعنوانی کے خلاف زبردست جوش و خروش ہے اور لوگوں کے جذبات میں ابال آیا ہوا ہے۔ اس بیداری کا سہرا بڑی حد تک میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے سر بھی جاتا ہے۔ لیکن اس کے متوازی یہ صورت حال بھی موجود ہے کہ میڈیا بھی کرپشن کے حمام میں دوسروں کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہے اور برہنہ کھڑا ہے۔ اس کا بھی دامن بدعنوانی کے داغوں سے صاف نہیں ہے۔ وہ اپنے مالی اہداف کی حصولیابی کی خاطر اکثر و بیشتر صحافتی اصولوں سے انحراف کرتے ہوئے سطحیت پر اتر آتا ہے اور اس سلسلے میں وہ کتنے نیچے تک جا سکتا ہے یا کہاں تک گر سکتا ہے، یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آج میڈیا میں پیڈ نیوز یعنی ''زرخرید خبر'' کا چلن بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات یہ امتیاز کرنا مشکل

ہوتا ہے کہ حقیقی خبر کون سی ہے اور جعلی و نقلی خبریں کون سی ہیں۔ لیکن ان برائیوں کے خلاف کوئی موثر آواز بلند نہیں ہوتی۔ کبھی آواز ضرور اٹھتی ہے پھر وہ بھی بیٹھ جاتی ہے۔ اردو صحافت بھی ان آلائشوں میں ملوث ہوتی جا رہی ہے اور اب ایسے صحافی پیدا ہونے لگے ہیں جو صحافت کے اعلیٰ اصولوں کو نہیں بلکہ مالی منفعت اور مادی آسائشوں کو ہی اخبار نویسی کی معراج تصور کرنے لگے ہیں۔ بلکہ بہت سے لوگ انہی مقاصد کو سامنے رکھ کر ہی صحافت میں آ رہے ہیں۔ تاہم جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا ہے، ایسے متعدد اخبار اور صحافی اب بھی موجود ہیں جو صحافت کی اعلیٰ قدروں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں اور دنیاوی عیش و عشرت کی قربان گاہ پر اصولوں اور قدروں کو ذبح کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ پریس کونسل اور دوسرے اداروں کی گائڈ لائن کی پابندی بھی کرتے ہیں۔

آج اس بات کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے کہ حقیقی صحافت کے تقاضے کیا ہیں، معاشرہ اور معاشرت کو کن چیزوں کی ضرورت ہے، قارئین کو کس قسم کی خبریں اور کیسے مضامین درکار ہیں، صحافتی قدروں کی پاسداری ہو رہی ہے یا پامالی اور مثبت صحافتی تقاضوں کی تکمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ تمام طبقوں کو اپنا احتساب کرنے کی بھی ضرورت ہے۔ ان کے لیے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھنا ضروری ہو گیا ہے کہ کیا وہ بے باکی اور بے خوفی اور سچائی و دیانت داری کے ساتھ اپنا فریضہ ادا کر رہے ہیں یا کسی سے انحراف کو ہی صحافت کا اعلیٰ معیار تصور کیے ہوئے ہیں۔ وہ حقیقی صحافت کے تقاضوں کی تکمیل کر رہے ہیں یا اخبار نویسی کے نام پر صحافت کی آبرو کو نیلام کرنے کی روش پر گامزن ہیں۔

ہمعصر اردو صحافت کا جائزہ

اگر ہم ملک گیر سطح پر اردو اخباروں کی اشاعت کا جائزہ لیں تو تعداد اخبار کے حوالے سے اردو صحافت تیسرے نمبر ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اخباروں کی تعداد میں اضافے کے ساتھ سرکولیشن میں کمی آتی جا رہی ہے۔ تعداد اخبار میں اضافے کے کئی اسباب ہیں، جن میں سب سے اہم سبب انفرادی طور پر جوش و جذبے کا ابھار ہے۔ کچھ لوگ یہ سوچ کر اردو اخبار شروع کر دیتے ہیں کہ اس طرح وہ معاشرے میں ایک باعزت مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوں گے۔ وہ جس کام میں ہاتھ ڈالیں گے وہ پورا ہو کر رہے گا۔ کچھ لوگ سیاسی عزائم کے تحت اخبار شروع کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی بنیاد پر وہ سیاسی حلقوں میں رسائی حاصل کر کے اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل تک پہنچ سکتے ہیں۔ ایسے لوگ کچھ دنوں تک تو اخبار جاری رکھتے ہیں لیکن جب ناکامی ان کا مقدر بن جاتی ہے تو وہ اخبار بند کر دیتے ہیں۔ لیکن وہ تا زندگی اپنے نام کے ساتھ ایڈیٹر کا لاحقہ جوڑے رکھتے ہیں۔ کچھ ایسے عزائم پسند ہوتے ہیں جو مالی منفعت کے لالچ میں ایڈیٹر بن جاتے ہیں۔ ایسے لوگ انتخابات کے مواقع پر برساتی مینڈکوں کی طرح سطح صحافت پر نمودار ہوتے ہیں اور اخباروں کو ملنے والے اشتہارات کے کوٹے میں اپنا حصہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اگر ان کے اثر و رسوخ سیاسی پارٹیوں میں گہرے ہیں تو وہ کئی جماعتوں کے اشتہارات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ انہی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو کسی ایک جماعت کے ہاتھوں اپنے اخبار کو گروی رکھ دیتے ہیں اور الیکشن کے بعد پھر اسے چھڑا لیتے ہیں۔ بلکہ اس کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ جہاں مخصوص جماعت نے نوازنے کا سلسلہ بند کیا اس اخبار میں اس جماعت کی قصیدہ خوانی بھی بند ہو جاتی ہے اور پھر مدیر اعلیٰ دوسری جماعتوں کے دفاتر کے چکر

نکالنے لگتے ہیں۔ ایسے اخبارات ایک الیکشن سیزن سے دوسرے الیکشن سیزن تک Suspended Animation میں رہتے ہیں۔ یعنی اس دوران وہ خواب خرگوش کے مزے لیتے ہیں اور دوسرے الیکشن کی آمد کے موقع پر بیدار ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگ محض جوڑ توڑ کی خاطر ہی اخبار جاری کر دیتے ہیں اور اخبار کی سانس اس وقت تک چلتی رہتی ہے جب تک جوڑ توڑ کا بازار گرم رہتا ہے۔

ایک معروف اردو صحافی اور عظیم آباد ایکسپریس کے سابق مدیر رضوان احمد کے مطابق "اردو صحافت کی صورت حال کو بہت امید افزا نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ جہاں علاقائی زبان میں ملیالم، تیلگو، تامل، بنگلہ، گجراتی، کنڑ وغیرہ میں کئی بڑے اخبارات شائع ہوتے ہیں وہیں اردو میں ایک بھی بڑا اخبار شائع نہیں ہوتا۔ یعنی بڑے اخبارات کی جو زمرہ بندی کی گئی ہے اس کے لحاظ سے اس کی تعداد اشاعت ایک لاکھ سے زائد ہونی چاہئے۔ لیکن اردو میں کوئی اخبار اس تعداد کو نہیں پہنچ پاتا۔ یہاں تک کہ جن اردو اخبارات کے کئی شہروں سے ایڈیشن شائع ہوتے ہیں ان کی جملہ تعداد اشاعت بھی یہاں تک نہیں پہنچ پاتی ہے۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے۔ لیکن اس پر غور و خوض کرنے سے بھی کیا ہوگا کیونکہ تعداد اشاعت کا تعلق قارئین سے ہے اور جب اخبارات کو قارئین دستیاب ہی نہیں ہوں گے تو ان کی اشاعت میں اضافہ کہاں سے ہوگا۔ اردو اخبارات کی تعداد ضرور بڑھی ہے لیکن تعداد اشاعت کے تناسب میں وہ دوسری زبانوں کے اخباروں سے بہت پیچھے ہو گئے ہیں حالانکہ ماضی میں یہ صورتحال نہیں تھی۔ 1980 تک اردو کے دو جرائد کی تعداد ایک لاکھ سے زائد تھی، جس میں بہت مقبول فلمی ماہنامہ "شمع" اور جالندھر سے شائع ہونے والا "ہند سماچار" بھی تھا۔ ان میں جہاں "شمع" بند ہو چکا ہے وہیں "ہند سماچار" کی اشاعت بھی کافی کم ہو گئی ہے۔ اس کے اسباب بھی ہیں۔ "ہند سماچار" جالندھر سے شائع ہوتا ہے جو کسی زمانے میں خالص اردو کا علاقہ تھا لیکن اب صرف وہاں پرانی نسل کے ہندو یا سکھ ہی اردو پڑھنا لکھنا جانتے ہیں۔ اسی لئے اخبار کے مدیر اشونی کمار بہت افسوس کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ جب کسی بوڑھے شخص کی ارتھی جاتے ہوئے دیکھتے ہیں تو انہیں افسوس ہوتا ہے کہ ان کے اخبار کا ایک قاری کم ہو گیا ہے۔ یہ صرف ان کا مرثیہ نہیں ہے بیاں دوکا بھی مرثیہ ہے کیونکہ اسی طرح سے اردو زبان قسطوں میں مر رہی ہے۔ اردو اخبارات کی بڑھی ہوئی تعداد سے کسی خوش فہمی کا شکار نہیں ہونا

جاتے۔ کیونکہ اردو میں شائع ہونے والے اخبارات بیشتر ذاتی کوششوں کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کا مقصد کسی کے عزائم کی تکمیل بھی ہوتا ہے اور جب یہ عزائم پورے ہو جاتے ہیں تو اخبار یا رسالہ خود بخود بند ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں جتنی جلدی اخبارات نکلنا شروع ہوتے ہیں اتنی ہی جلدی بند بھی ہو جاتے ہیں۔ دراصل اردو اخبارات منظم ضابطے کے تحت نہیں نکالے جاتے ان کا تجارتی پہلو سامنے نہیں رہتا اس وجہ سے بھی یہ بہت جلد دم توڑ دیتے ہیں۔ آج کے زمانے میں اخبار صنعت و تجارت بن گئے ہیں۔ اس کے اس پہلو سامنے نہیں رکھا جائے گا تو وہ اخبار زیادہ دیر تک نہیں چل سکتا۔ ہم یہ مانتے تو ضرور ہیں کہ اردو اخبارات کے قارئین کے پاس قوت خرید نہیں ہے لیکن ایسا کیوں ہے جب ہم اخبار ان کے پاس پہنچا ہی نہیں پاتے ہیں تو پھر وہ اس کی خریداری کیونکر کرسکتے ہیں۔“

عہد موجود کے تقاضوں کو اردو اخبارات ضرور پورا کر رہے ہیں۔ وہ بھی دوسری زبانوں کے اخباروں کی مانند کلر فل نکلتے ہیں اور ان میں چمک دمک بھی خوب ہوتی ہے۔ لیکن بعض وقت بعض اخباروں میں رنگوں کا امتزاج اس قدر بے میل یا بیجابات کے ساتھ ہوتا ہے کہ خبر کی معنویت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ایسے اخباروں کو دیکھ کر ہی اردو کے مستند اور بڑے مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ اردو اخبارات سنگین خبروں کو رنگین انداز میں شائع کرتے ہیں۔ بعض اخباروں کے چہرے رنگ و روغن اور غازہ و پوڈر سے اس قدر دبے ہوتے ہیں کہ ان کی اصل صورت نظر آتی ہے اور نہ ہی خبروں کی۔ لیکن بہرحال اردو اخبار بھی زمانے کا ساتھ دے رہے ہیں۔ رضوان احمد کے مطابق ”طباعت کے انقلاب نے اردو اخبارات کو بھی اس سے آشنا کیا ہے۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ جہاں پوری دنیا کی اخباری صنعت میں بڑا انقلاب لائے ہیں وہیں اردو اخبارات بھی اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ طباعت کے لحاظ سے وہ خوبصورت اور جاذب نظر ہوتے ہیں کیونکہ دوسری زبان کے اخباروں کی طرح ان کی بھی چھپائی ہو رہی ہے۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ نے انھیں تیز رفتار بنا دیا ہے۔ اب وہ خبروں میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ لیکن دشواری وہی ہے کہ ضرورت مند تک پہنچ نہیں پاتے ہیں۔ کسی بھی اردو اخبار نے اتنا بڑا نیٹ ورک تیار نہیں کیا ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے جہاں اس کی ضرورت ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں کوئی بڑا اخبار نہیں ہے۔ اس لئے کہ ہر اردو اخبار کچھ خاص علاقہ تک محدود ہے۔ اس کی اشاعت ایک خاص حلقے تک ہے۔ اس سے آگے بڑھنے کی یا تو اس میں سکت نہیں ہے یا خواہش نہیں ہے۔ حالانکہ اب نقل و حمل کے ایسے ذرائع موجود ہیں کہ اخبار کو قومی بننے میں دشواری پیش نہیں آنی چاہئے۔ لیکن اردو کا کوئی اخبار قومی اخبار کیوں نہیں بن پاتا یہ اپنے آپ میں ایک بڑا سوالیہ نشان ہے۔ حالانکہ پہلے جو اخبارات قومی اخبار کہلاتے تھے اب ان پر بھی یہ سوالیہ نشان لگ گیا ہے کہ وہ ہر ریاست کے اہم شہر سے اور پھر ذیلی شہروں سے بھی اپنے ایڈیشن شائع کر رہے ہیں۔ اس سے ایک جانب یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی تعداد اشاعت سے مطمئن نہیں ہیں لیکن اس کی دوسری بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اخبارات تجارتی پہلو کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان کا مقصد ریاستوں یا ضلعوں میں پھیلی ہوئی صنعتوں کے اشتہار حاصل کرنا ہے تاکہ ایک جانب وہ جہاں اپنی معاشیات کو مضبوط کر سکیں وہیں دوسری جانب حلقۂ اثر کو بڑھا سکیں۔ در حقیقت یہ اخبار خالص معاشی نظریے سے نکالے جا رہے ہیں کیونکہ ان کا تعلق صنعتی گھرانوں سے ہے۔ ان اخباروں کے پھیلاؤ سے مقامی اخبارات کو کافی نقصان اٹھانا پڑ رہا ہے۔"

دہلی کی اردو صحافت پر ایک نظر

ہندوستان میں صحافت کی جائے پیدائش کلکتہ ہے۔ اردو، انگریزی اور ہندی تینوں زبانوں کی صحافت کا جنم اسی شہر میں ہوا۔ رفتہ رفتہ دوسرے شہروں میں دوسری زبانوں کی مانند اردو صحافت بھی شروع ہوئی اور اخبارات و رسائل شائع ہونے لگے۔ راجدھانی دہلی اردو کا ایک مرکز رہی ہے۔ لہٰذا یہاں بھی صحافت کا آغاز ہوا اور وہ بتدریج ترقی کرتی گئی۔ آج بھی دہلی اردو صحافت کا ایک مرکز ہے جہاں سے روزنامے، سہ روزہ، ہفت روزہ، پندرہ روزہ، ماہنامہ، سہ ماہی، ششماہی اور سالانہ اخبارات و رسائل شائع ہو رہے ہیں۔

اس وقت دہلی میں 55 روزنامہ اخبارات اشتہارات کے سرکاری ادارے ڈی اے وی پی سے منظور شدہ ہیں، جن میں راشٹریہ سہارا، انقلاب، صحافت، ہمارا سماج، ہندوستان ایکسپریس، اخبار مشرق، ملاپ، پرتاپ، تیج اور جدید خبر قابل ذکر ہیں۔ ڈی اے وی پی سے غیر منظور شدہ اخباروں وغیرہ یہاں مجموعی طور پر ایک سو سے زائد اردو روزنامے شائع ہو رہے ہیں جبکہ ہفت روزہ جرائد کی تعداد پندرہ ہے۔ جن میں نئی دنیا، اخبار نو، عالمی سہارا، چوتھی دنیا، صدائے انصاری اور الجمعیۃ قابل ذکر ہیں۔ پندرہ روزہ جرائد کی تعداد چھ ہے جن میں خبردار جدید اور کاروان دہلی ایک عرصے سے نکل رہے ہیں۔ ماہنامہ جریدوں کی تعداد پانچ ہے جن میں افکار ملی اور عالمی وجود قابل ذکر ہیں۔ ایک سہ روزہ اخبار دعوت بھی ہے۔ یہ تمام وہ ہیں جن کو ڈی اے وی پی سے منظوری حاصل ہے۔ غیر منظور شدہ جرائد کی تعداد کافی ہے، جن میں ماہنامہ ملی اتحاد، ماہنامہ کتاب نما، دو ماہی بک ریویو اور سہ ماہی نئی کتاب کا نام لیا جا سکتا ہے۔ دہلی میں مذہبی رسائل بھی شائع ہوتے ہیں ان کی تعداد تمیں ہے۔ ان میں زندگی نو، جریدہ ترجمان، نوائے

اسلام، جام نور، ماہ نور، ترجمان دارالعلوم، اللہ کی پکار، رفیق منزل، کنز الایمان، ہدی، ذکری، الشمیان اور منادی قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری و پرائیویٹ سطح پر ادبی رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ سرکاری ادبی رسالوں میں آجکل، اردو دنیا، ایوان اردو، دہلی، ہماری زبان، اردو ادب، فکر و تحقیق اور غیر ادبی سرکاری جرائد میں یوجنا، سینک سماچار اور سائنس کی دنیا قابل ذکر ہیں۔ غیر سرکاری ادبی رسائل میں ذہن جدید، ادب ساز، جہان غالب اور عالمی اردو ادب کو رکھا جا سکتا ہے۔ طب و صحت، سائنس اور آرائش و زیبائش سے متعلق رسائل بھی یہاں سے شائع ہوتے ہیں۔

روزنامہ اخبارات

آئیے اب ذرا روزنامہ صحافت کا جائزہ لیتے ہیں کیونکہ حقیقی صحافت کا اندازہ روزنامہ اخباروں سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہاں کا کثیر الاشاعت روزنامہ اخبار راشٹریہ سہارا ہے۔ یہ سہارا گروپ کا اخبار ہے اور دس شہروں سے نکل رہا ہے۔ دوسرے نمبر پر انقلاب ہے، جس کا ہیڈکوارٹر تو ممبئی ہوا کرتا تھا لیکن جب سے اس کو ہندی اخبار دینک جاگرن کی انتظامیہ نے خریدا ہے اس کا عملی ہیڈکوارٹر دہلی ہو گیا ہے۔ یہ اخبار دس شہروں سے نکل رہا ہے۔ مختلف شہروں سے نکلنے کی وجہ سے ان دونوں اخباروں کی مجموعی سرکولیشن خاصی ہے۔ روزنامہ صحافت چار شہروں سے شائع ہوتا ہے لیکن اس کی سرکولیشن ان دونوں سے بہت کم ہے۔ باقی اخبارات بہت کم تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔

آج چونکہ اردو زبان زوال پذیر زبان بن گئی ہے لہٰذا اس کی صحافت بھی زوال آمادہ ہے۔ یہ صورت حال دہلی سمیت دیگر تمام شہروں کی ہے۔ کم از کم شمالی ہند میں تو اردو زبان سکڑتی جا رہی ہے۔ حالانکہ دہلی سے بڑی تعداد میں اخبارات نکل رہے ہیں لیکن اگر ہم ان کے معیار پر نظر ڈالیں تو مایوسی ہوتی ہے۔ دہلی کے بیشتر اخباروں میں ایک بڑی اور خطرناک برائی در آئی ہے جو دوسرے شہروں کے اخباروں میں بھی داخل ہوتی جا رہی ہے۔ وہ خرابی ہے پاکستانی اخبارات سے مواد کا سرقہ۔ چھوٹے اور متوسط اخبارات کے کئی صفحات کا پیٹ پاکستانی اخبارات کی غذا سے بھرا جا رہا ہے جو آگے چل کر بہت خطرناک ہو سکتا ہے۔ یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ سرکاری ایجنسیاں اردو

اخباروں پر بھی نظر رکھتی ہیں اور ان کا ایک ایک لفظ نہ صرف یہ کہ پڑھا جاتا ہے بلکہ متعلقہ خبروں کی فائل بھی بنائی جاتی ہے۔ اگر حکومت چاہے تو ان اردو اخباروں پر پاکستان کا ایجنٹ ہونے کا الزام عائد کر سکتی ہے۔ اس پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کے علاوہ ایک تشویش ناک بات یہ بھی پیدا ہو گئی ہے کہ بعض ایسی ایجنسیاں وجود میں آ گئی ہیں جو مسلم دشمن یا اردو دشمن عناصر کی زرخرید ہیں اور ان کی پالیسیوں کو آگے بڑھانے اور اردو حلقوں میں خاموشی کے ساتھ اندر ہی اندر پیوست کرنے کے مقصد سے خبریں اور مضامین ترسیل کرتی ہیں۔ چھوٹے اور متوسط اخبارات ان مواد کو بغیر ایڈٹ کیے چھاپ دیتے ہیں اور یہ دیکھنے کی ذرا بھی زحمت گوارہ نہیں کرتے کہ ان مضامین یا خبروں میں کیا کچھ ہے۔ چونکہ ان کو مفت میں کمپوزڈ میٹر مل جاتا ہے اس لیے وہ اس کو نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے اپنی دانست میں انتہائی عقلمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھاپ دیتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر Reproduce کر دیتے ہیں۔ دہلی میں یہ بدعت تیزی سے پھیلتی جا رہی ہے۔ دوسرے شہروں میں بھی کچھ اسی قسم کے حالات پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ انتہائی تشویشناک ہے۔ آگے چل کر اس کے کیسے بھیانک نتائج سامنے آئیں گے اس پر ابھی کسی کی نظر نہیں ہے۔

بہر حال ابھی ذکر ہو رہا تھا دہلی کے اخباروں کے غیر معیاری ہوتے جانے کا۔ کوئی شک نہیں کہ آج دہلی میں صحافت کا دامن نو بہ نو اخباروں کی خوشبو سے معطر ہے۔ لیکن ان میں تجربہ کار صحافیوں کا بہت ٹوٹا ہے۔ اردو صحافیوں کی کوئی ٹریننگ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے اخباروں کے رپورٹر خبر سازی تک نہیں جانتے۔ ترجمہ کی صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے انگریزی کے الفاظ کو جوں کا توں رکھ دیا جاتا ہے۔ بہت سے اردو الفاظ اردو اخباروں سے کٹ گئے ہیں اور ان کی جگہ ہندی لفظوں نے لے لی ہے۔ آج دہلی کے اخباروں کا دامن معیاری زبان اور ذخیرہ الفاظ کے حوالے سے تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ لیکن بہر حال اردو کے اس زوال آمادہ دور میں جو اخبارات نکل رہے ہیں اور جیسے بھی نکل رہے ہیں، غنیمت ہیں۔ ورنہ اب تو ایک منصوبہ بند سازش کے تحت یہ بحث چھیڑ دی گئی ہے کہ اردو زبان پڑھنے سے کیا ہوگا اس سے ملازمت نہیں ملتی اس سے روزی روٹی نہیں چلتی۔ ایسی بحث چھیڑ کر اردو خواندگی سے لوگوں کو برگشتہ کیا جا رہا ہے اور جانے انجانے میں بہت سے اردو والے بھی اس سازش کے آلۂ کار بن رہے ہیں۔ اگر یہ بحث

خطرناک رخ اختیار کرے تو جو تھوڑے بہت لوگ اپنی اولاد کو اردو کی تعلیم دلواتے ہیں وہ بھی بند کر دیں گے اور جب اردو پڑھنے والے ہی نہ ہوں گے تو اردو اخبار کون خریدے گا اور کون بیچے گا۔ نئی نسل یوں بھی اردو سے بیگانہ ہوتی جا رہی ہے۔ جو پرانی دو تین نسلیں ہیں وہی اردو سے کم حقہ واقف ہیں یا پھر دینی مدارس کے فارغین ہیں جو اردو کی لاج رکھے ہوئے ہیں۔ اگر یہ مدارس نہ ہوں اور اردو جاننے والی نسل ختم ہو جائے تو مذکورہ اردو روزناموں کا حال بھی دہلی ہی سے شائع ہونے والے ملاپ، پرتاپ اور تیج جیسا ہوگا۔ یہ اخبار اگرچہ اردو رسم الخط میں چھپتے ہیں لیکن ان میں تقریباً ساٹھ فیصد الفاظ ہندی کے استعمال ہوتے ہیں اور ان اخباروں کو تقسیم ہند کے وقت پاکستان سے آنے والی وہ نسل پڑھتی ہے جسے شرنارتھی کہا جاتا تھا۔ مذکورہ تینوں اخباروں میں سے اول الذکر دو اخباروں کی پالیسی مسلم مخالف اور آر ایس ایس نواز ہے۔ اور چونکہ اردو اب رفتہ رفتہ صرف مسلمانوں کی زبان بنتی جا رہی ہے اسی لیے ان تینوں اخباروں کو مسلمان نہیں پڑھتے۔ (اگرچہ ابھی پوری طرح نہیں بنی ہے ابھی بہت سے غیر مسلم اردو داں موجود ہیں جو اردو سے پیار کرتے ہیں اور گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہیں)۔ دہلی کی اردو صحافت میں ان کا بھی بڑا حصہ ہے۔ اس سے قطع نظر اب خبروں کی پالیسی کی بات۔ ہم اگر اردو صحافت کا جائزہ لے رہے ہیں تو ہمیں اردو اخبار والوں کو خبر کو خبر ہی سمجھنا چاہیے، مسلم یا اسلامی خبر نہیں سمجھنا چاہیے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ آج کل اردو اخبار مسلم اخبار بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ صرف مسلمانوں کے مسائل اٹھاتے ہیں اور ہر خبر اور واقعہ کو مسلم آئینے میں دیکھتے ہیں، جس کی وجہ سے بعض اوقات بڑی نازک صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ صحافی کو صرف صحافی ہونا چاہیے، مسلمان یا ہندو صحافی نہیں۔ صحافی کا قلم پوری قوم کی امانت ہوتا ہے۔ وہ کسی خاص فرقہ، مذہب یا ذات برادری کا نمائندہ نہیں ہوتا۔ انگریزی کے اخبار پوری طرح تو نہیں لیکن بڑی حد تک اس اصول کو اپنائے ہوئے ہیں اور دہلی ہی سے شائع ہونے والے انگریزی کے کئی اخبار مسلم ایشوز پر خوب لکھتے ہیں۔ لیکن وہ مسلمانوں کی حمایت اس وجہ سے نہیں کرتے کہ وہ مسلمان ہیں بلکہ وہ مظلوم کی حمایت کرتے ہیں اور کسی بھی واقعہ میں کیا حقیقت ہے اس پر ان کی نظر رہتی ہے۔ اردو کے صحافیوں کو بھی اس اصول کو اپنانا چاہیے۔ انھیں مسلم صحافی کے بجائے ایک قومی صحافی کی حیثیت سے اپنا کام انجام دینا چاہیے۔

(حالانکہ بیشتر قومی اخبارات مسلم ایشوز پر انتہائی جانبدارانہ اور متعصبانہ رخ اختیار کرتے ہیں اور صرف انہی مسلم ایشوز کو اٹھاتے ہیں جن سے وہ مسلمانوں کی شبیہ خراب کرکے پیش کرسکیں۔ اس رویے اور روش کی بہر حال مذمت کی جاتی ہے اور کی جانی بھی چاہیے)۔

بات ہو رہی تھی دہلی کے اردو اخباروں کے معیار کی۔ اس وقت اگرچہ یہاں کے اردو اخباروں کا معیار پست ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہی اخباروں میں شائع خبروں کا اثر بھی ہوتا ہے۔ زبان کے معاملے میں عدم معیار کے باوجود اردو کے ایسے متعدد رپورٹر اور صحافی ہیں جو ایکسکلوزیو خبریں لاتے ہیں اور مختلف سطحوں پر بدعنوانیوں اور دہشت گردی کے نام پر مسلمانوں کے ساتھ ہو رہی زیادتیوں کو بے نقاب بھی کرتے ہیں۔ کاغذ اور چھپائی کے اعتبار سے ان اخباروں کا معیار اچھا ہے اور کئی روزنامہ اور ماہنامہ اخبار و رسائل تو ایسے ہیں جن کو صوری اعتبار سے انگریزی اور ہندی اخباروں کے بالمقابل رکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک اچھی روایت شروع ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور اچھی روایت شروع ہوئی ہے۔ جب سے کاروباری اداروں نے اردو صحافت میں قدم رکھا ہے اردو اخبارات کے حالات میں بہتری آئی ہے۔

دہلی کے چند اہم صحافی

اس وقت دہلی کے اردو صحافیوں میں سب سے بزرگ صحافی جی ڈی چندن ہیں۔ •• اگرچہ کسی اخبار سے وابستہ نہیں رہے ہیں لیکن اردو کی روایتی صحافت پر بالخصوص اعداد وشمار کے حوالے سے ان کو ایک اتھارٹی سمجھا جاتا ہے۔ وہ تقسیم ملک کے وقت پاکستان سے ہندوستان آئے تھے اور بعد میں ان کی تقرری پریس انفارمیشن بیورو (پی آئی بی) میں اردو آفیسر کے عہدے پر ہوئی تھی۔ اردو صحافت کی تاریخ کا علم اس وقت جتنا ان کو ہے شاید ہی کسی اور کو ہوگا۔ صحافت پر ان کی متعدد کتابیں ہیں۔ سردست وہ دہلی کے قریب گوڑگاؤں میں اپنے بیٹے کے ساتھ اقامت پذیر ہیں۔

م۔ افضل سینئر اردو صحافی ہیں۔ انھوں نے محنت اور جاں فشانی سے صحافت میں اپنا ایک اعلیٰ مقام بنایا ہے اور سیاست میں بھی کافی ترقی کی ہے۔ انھوں نے ایک ہفت روزہ ”اخبار نو“

کے نام سے نکالا جو اب بھی مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ کسی زمانے میں ''اخبارِ نو'' ہندوستان کا دوسرا بڑا ہفت روزہ اخبار تھا۔ ان میں صحافیانہ صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہیں۔ صحافت کے راستے وہ سیاست میں پہنچے اور راجیہ سبھا کے رکن بنے۔ انھوں نے اپنی رکنیت کے دوران اردو زبان سے متعلق جتنے سوالات پارلیمنٹ میں کیے تھے اتنے سوال کوئی اور رکن کسی بھی زبان کی صحافت کے بارے میں نہیں کر سکا ہے۔ وہ ایک عرصے سے ''آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس'' کے صدر ہیں۔ راجیہ سبھا کی رکنیت ختم ہونے کے بعد ان کو دو بار سفیر بنایا گیا۔ انھوں نے انگولا، کانگو، گیبن اور آخر میں ترکمانستان میں سفارتی خدمات انجام دیں۔ وہ دہلی اردو اکادمی کے وائس چیئرمین بھی رہے ہیں۔ اس وقت دہلی میں ہیں اور کانگریس پارٹی میں سرگرم ہیں۔

شاہد صدیقی مولانا عبدالوحید صدیقی کے بیٹے اور اردو کے سرکردہ صحافی ہیں۔ وہ اس وقت دو اخبارات ہفت روزہ ''نئی دنیا'' اور روزنامہ ''عوام'' کے مدیر اعلیٰ ہیں۔ انھوں نے بھی محنت شاقہ سے صحافت میں ایک اہم مقام بنایا ہے۔ وہ صحیح معنوں میں صحافی ہیں۔ نئی دنیا کسی زمانے میں ملک کا سب سے بڑا ہفت روزہ اخبار تھا اور اس میں شائع ہونے والے مضامین کافی اہم سمجھے جاتے تھے۔ لیکن اب چونکہ ہفت روزہ صحافت پر زوال آ گیا ہے لہٰذا اب بھی نئی دنیا ملک کا سب سے بڑا ہفت روزہ اخبار ہے۔ شاہد صدیقی کچھ عرصہ قبل بہت اچھا ہندی ہفت روزہ ''نئی زمین'' کے نام سے نکال چکے ہیں۔ اس وقت وہ لکھنؤ سے ایک روزنامہ بھی نکال رہے ہیں۔ وہ راجیہ سبھا کے رکن بھی رہ چکے ہیں۔

پرواز رحمانی سنجیدہ صحافی ہیں اور ایک طویل عرصے سے ''سہ روزہ دعوت'' کے ایڈیٹر ہیں۔ قومی و بین الاقوامی سیاست پر ان کی گہری نظر ہے۔ ان کی تحریروں میں ملی فکرمندی واضح طور پر جھلکتی ہے۔ سنجیدگی ان کی تحریروں کی اہم خصوصیت ہے اور وہ عام فہم زبان میں تجزیہ و تبصرہ کرنے کا سلیقہ بخوبی جانتے ہیں۔ وہ صحافتی قدروں کی پاسداری کرتے ہیں اور اپنے قلم اور اپنے لفظوں سے سمجھوتہ کرنا ان کو پسند نہیں ہے۔

مسعود صدیقی کئی دہائیوں سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں۔ وہ متعدد بڑے صحافیوں اور ادیبوں کے ساتھ کام کر چکے ہیں۔ انھوں نے اردو صحافت کی ایک ڈائرکٹری مرتب کی ہے جس کی

خاصی پذیرائی ہوئی ہے اور جو اس موضوع پر پہلی اور واحد کتاب ہے۔ اردو صحافت کی تاریخ پر موودہ صدیقی کی گہری نظر ہے۔ وہ میدان صحافت کے تکنیکی پہلوؤں کی بھی خاصی معلومات رکھتے ہیں جو ان کی ایک اضافی خوبی ہے۔ وہ سہ روزہ ہفت روزہ اخبار نو سے وابستہ ہیں اور اس کے منیجنگ ایڈیٹر ہیں۔

عزیز برنی بھی ایک صحافی کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ وہ ایک عرصے تک راشٹریہ سہارا کے گروپ ایڈیٹر رہے ہیں۔ روزنامہ "راشٹریہ سہارا" پہلے صرف دہلی سے نکلتا تھا لیکن اب وہ کئی شہروں سے نکل رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف شہروں سے جاری کرنے میں عزیز برنی کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ مختلف موضوعات پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

معصوم مرادآبادی بھی ان صحافیوں میں شامل ہیں جو اپنی محنت اور صلاحیت کے بل بوتے پر آگے بڑھے ہیں۔ وہ کئی برسوں سے "خبردار جدید" کے نام سے پندرہ روزہ اخبار نکال رہے ہیں۔ چند سال قبل انھوں نے "جدید خبر" کے نام سے روزنامہ بھی شروع کیا جو پابندی کے ساتھ نکل رہا ہے اور متوسط اخباروں میں ایک معیاری اخبار سمجھا جاتا ہے۔ وہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

ڈاکٹر سید قاسم رسول الیاس ماہنامہ "افکار ملی" کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ گزشتہ 20 برسوں سے یہ رسالہ نکال رہے ہیں۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ جذباتی صحافت نہیں کرتا اور معاملات کو سلجھے ہوئے انداز میں دیکھتا ہے۔ اس کے مضامین معیاری ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر الیاس صحافت کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔ وہ نو تشکیل سیاسی جماعت "ویلفیئر پارٹی آف انڈیا" کے صدر منتخب کئے گئے ہیں۔

نصرت ظہیر بھی ایک سینئر صحافی ہیں۔ وہ دہلی کے ہفت روزہ اخبار "ملی قیادت" کے سابق ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے کئی برسوں تک امریکی سفارت خانے کے اردو رسالے "اسپین" کی بھی ادارت کی ہے۔ سنجیدہ ذہن اور ملی فکر کے صحافی ہیں اور حالات حاضرہ پر ان کے مضامین میں گہرائی و گیرائی ہوتی ہے۔ وہ ایک پختہ کار طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔

اے یو صف بنیادی طور پر انگریزی کے صحافی ہیں لیکن اردو میں بھی مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ مختلف موضوعات پر ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ وہ نیوز پورٹل ''فاناواچ ڈاٹ کام'' کے ایڈیٹر ہیں۔ بین الاقوامی سیاست اور حالات حاضرہ پر ان کی گہری نظر ہے۔ کسی بھی واقعہ کے تجزیہ کے دوران وہ جزیات پر بھی باریک بینی سے نظر رکھتے ہیں جو ان کی تحریروں کی اضافی خاصیت ہے۔

شکیل شمسی روزنامہ ''انقلاب'' کے ایڈیٹر نارتھ ہیں۔ وہ اس سے قبل روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' سے وابستہ رہے ہیں۔ ان کی صحافت کا آغاز دوردرشن سے ہوا تھا۔ راشٹریہ سہارا سے ان کو ایک شناخت ملی اور اب وہ بھی معروف صحافیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ٹیلی ویژن کی صحافت پر ان کی ایک کتاب بھی شائع ہوئی ہے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی ہیں۔

راقم حروف (سہیل انجم) تقریباً پچیس سالوں سے صحافت سے وابستہ ہے۔ روزنامہ قومی آواز سمیت مختلف اخباروں میں کام کر چکا ہے۔ اس نے صحافت کا باضابطہ آغاز ہفت روزہ اخبار نو سے کیا تھا۔ وہ مارچ 2002 سے وائس آف امریکہ اردو سروس کے لیے بھی کام کر رہا ہے۔ اس کی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں صحافت کے موضوع پر اس کتاب کے علاوہ مزید چار کتابیں ہیں جو خاصی مقبول ہوئی ہیں اور ان کو مختلف اکیڈمیوں سے بہترین کتاب کے ایوارڈ ملے ہیں۔ مختلف اخباروں میں اس کے کالم پابندی کے ساتھ شائع ہوتے ہیں۔

وسیم الحق روزنامہ ''اخبار مشرق'' کے ایڈیٹر ہیں۔ یہ اخبار پہلے کلکتہ سے نکلتا تھا۔ وہاں سے اب بھی نکل رہا ہے۔ کئی سال سے وہ دہلی سے بھی نکال رہے ہیں۔ اس کی تعداد اشاعت بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن مواد کے اعتبار سے اس میں تنوع ہے۔

ظفر آغا روزنامہ ''جدید میل'' کے ایڈیٹر ہیں۔ وہ پہلے انگریزی صحافت میں تھے۔ اردو اخباروں میں کالم نویسی کے توسط سے انھوں نے اردو صحافت میں قدم رکھا اور اب ایک اردو ایڈیٹر کی حیثیت سے بھی ان کی شہرت ہے۔ وہ دوسرے اخباروں میں اب بھی کالم لکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ ای ٹی وی اردو پر ان کا ایک مقبول عام پروگرام ''گفتگو'' آتا ہے جس میں وہ کسی شخصیت سے انٹرویو کرتے ہیں۔ ظفر آغا تعمیری اور صحت مند صحافت میں یقین رکھتے ہیں۔

شیخ منظور احمد ایک خبر رساں ایجنسی ''عالمی اردو سروس'' کے ایڈیٹر ہیں۔ اس سے قبل وہ خبر رساں ایجنسی یو این آئی میں انگریزی صحافی کے طور پر کام کر رہے تھے۔ بعد میں ان کو اردو یو این آئی کا ایڈیٹر بنایا گیا تھا اور اسی حیثیت سے وہ وہاں سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

رضوان اللہ اور سعید سہروردی دہلی کے بزرگ صحافیوں میں شامل ہیں۔ اول الذکر نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ کلکتہ کی صحافت میں گزارا۔ اس کے بعد وہ دہلی میں امریکی سفارت خانہ میں شعبہ اردو کے عرصے تک انچارج رہے ہیں۔ وہ اردو کی مانند انگریزی کے بھی صحافی ہیں۔ ضعیف العمری کے سبب سرگرم صحافت سے کنارہ کش ہیں لیکن ان کے مضامین اب بھی اخباروں میں شائع ہوتے ہیں۔ ان کی متعدد کتابیں شائع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ جبکہ سعید سہروردی بھی ضعیف العمری کی وجہ سے سرگرم صحافت سے کنارہ کش ہیں۔

اسد رضا روزنامہ ''راشٹریہ سہارا'' کی اردو اشاعتوں کے سربراہ ہیں۔ اس سے قبل وہ سوویت انفارمیشن سینٹر کے جریدہ ''سوویت جائزہ'' میں کام کر چکے ہیں۔ وہ ایک شاعر اور طنز و مزاح نگار بھی ہیں۔

دہلی کے سرگرم صحافیوں میں ایک اہم نام سید منصور آغا کا بھی ہے۔ وہ روزنامہ قومی آواز سے چیف سب ایڈیٹر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے تھے۔ اس وقت ان کے کالم ملک و بیرون ملک کے مختلف اخباروں میں شائع ہو رہے ہیں۔ وہ انگریزی میں بھی کالم نگاری کرتے ہیں اور انسانی حقوق کی ایک تنظیم بھی چلاتے ہیں۔

قاری محمد میاں مظہری ''سیکولر قیادت'' کے ایڈیٹر ہیں۔ پہلے یہ اخبار ہفت روزہ تھا اب روزنامہ نکل رہا ہے۔ عتیق صدیقی روزنامہ ایوم اور وحدت نو کے ایڈیٹر ہیں۔ ایس ایم آصف روزنامہ ''ان دنوں'' کے ایڈیٹر ہیں۔

سید اجمل حسین روزنامہ قومی آواز میں چیف سب ایڈیٹر رہے ہیں۔ اس وقت وہ ایک معروف ویب سائٹ ''اردو تہذیب ڈاٹ کوم'' میں اردو سائٹ کے ایڈیٹر ہیں۔ اسی طرح نایاب حسن بھی قومی آواز میں چیف سب ایڈیٹر رہے ہیں۔ وہ اس وقت خبر رساں ایجنسی ''عالمی اردو سروس'' کے ایڈیٹر انچارج ہیں۔

دہلی کے اردو صحافیوں میں اصغر انصاری (ایڈیٹر یو این آئی)، خالد انور (ایڈیٹر روزنامہ ہمارا سماج)، حسن شجاع (ایڈیٹر روزنامہ صحافت)، انصاری اطہر حسین (ایڈیٹر صدائے انصاری)، احمد جاوید (انقلاب) ظفر ندیم، سلیم شیرازی، عبدالباری مسعود، جاوید قمر، نزہت ندیم، ایم۔ ودود ساجد، قاسم سید، صالح عبداللہ اور مولانا عقیدت اللہ قاسمی وغیرہ بھی اپنی شناخت رکھتے ہیں۔

اردو اخبارات ورسائل اور روزگار

چند لوگ بڑی شد و مد کے ساتھ کہتے ہیں کہ اردو کا رشتہ روزگار سے کٹ گیا ہے اور معاش سے اس کا تعلق کمزور ہو گیا ہے، لہٰذا اردو پڑھنے پڑھانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ لیکن راقم الحروف اسے حقائق کے یکطرفہ تجزیے اور تصویر کے صرف ایک ہی رخ کو دیکھنے پر محمول کرتا ہے۔ یہ بات تو حق ہے کہ آزادی کے بعد مختلف وجوہات سے اردو اور روزگار کا باہمی رشتہ بتدریج کمزور ہوا ہے لیکن اردو کا دامن روزی روٹی کے امکانات سے یکسر خالی ہو گیا ہو، یہ بات درست نہیں ہے۔ جب ہم "اردو اخبارات و رسائل اور روزگار کے امکانات" کے موضوع پر غور کرتے ہیں تو اس کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں اور غیر سرکاری اخبارات و رسائل، سرکاری رسائل، دینی اور ادبی رسائل و جرائد اور اسی طرح جیسے تعلیمی، سائنسی، اصلاحی، اقتصادی وغیرہ اخبارات و رسائل ہمارے سامنے ابھر جاتے ہیں۔ پھر ذرا اور آگے نگاہ دوڑاتے ہیں تو دوسرے ملکوں سے شائع ہونے والے اردو کے ادبی اور غیر ادبی رسائل و جرائد بھی دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں تک غیر سرکاری اخبارات و رسائل کا تعلق ہے تو ان کی تعداد سرکاری رسائل و جرائد سے کہیں زیادہ ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہی اردو صحافت کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ سرکاری رسائل و جرائد حکومت کی پالیسیوں کے تحت شائع ہوتے ہیں اور ان کا مقصد سرکاری پروگراموں کی ترویج و اشاعت ہے۔ لیکن ان کو بھی بہر حال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آزادی سے قبل پہلے فارسی پھر اردو زبان کا رواج تھا۔ سارے کام، سرکاری اور غیر سرکاری، اردو ہی میں ہوتے تھے۔ لیکن آزادی کا سورج اردو کے لیے خوش آئند ثابت نہیں ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ آفتاب آزادی کی تمازت تو بڑھتی گئی لیکن اردو کا سورج گہناتا گیا۔ ایک

مخصوص پالیسی اور خاص ذہنیت کے تحت اردو کو عوامی زندگی سے رفتہ رفتہ دیس نکالا دے دیا گیا اور ایک منظم منصوبہ بندی کے تحت اردو کے خلاف پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا۔ لہٰذا آج یہ نوبت آ گئی ہے کہ خود اردو والے ہی کہتے ہیں کہ اردو پڑھنے لکھنے سے کوئی فائدہ نہیں، اس سے روزگار نہیں ملے گا۔

اعداد و شمار

اگر ہم اعداد و شمار کی روشنی میں دیکھیں تو جہاں ایک طرف اردو کی صورت حال بہت اطمینان بخش نہیں ہے اور اس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں کمی آتی جا رہی ہے وہیں دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آزادی کے بعد اردو اخباروں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ بھی ہوا ہے اور یہ اضافہ بتدریج تیز ہوتا جا رہا ہے۔ اردو کے بزرگ صحافی جی ڈی چندن نے اپنی تصنیف "اردو صحافت کا سفر" میں ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لعل نہرو کی ایک تقریر کے حوالے سے جو انہوں نے 10 اکتوبر 1961 کو نئی دہلی میں اردو اخباروں اور کتابوں کی کل ہند نمائش کے موقع پر کی تھی، لکھا ہے "تقسیم ہند کے وقت متحدہ ہندوستان میں اردو اخباروں کی تعداد 515 تھی جو تقسیم کے بعد گھٹ کر 345 رہ گئی" یعنی 170 اخبارات پاکستان میں چلے گئے تھے۔ اس کے بعد ہندوستان میں اردو اخباروں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہوا ہے۔ رجسٹرار نیوز پیپرز آف انڈیا یعنی آر این آئی کی رپورٹ کے مطابق 1957 میں ہندوستان میں اردو اخبارات و جرائد کی کل تعداد 513 تھی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آزادی کے بعد کے پہلے عشرے میں دشوار کن حالات کے باوجود اردو اخباروں کی تعداد میں تقریباً 49 فیصد کا اضافہ ہوا۔ اس کے چالیس سال کے بعد 1997 میں ان کی مجموعی تعداد 2670 ہو گئی۔ تعداد اشاعت کے اعتبار سے 1957 میں اردو صحافت کا مقام چوتھا تھا۔ پہلے اور دوسرے نمبر پر ہندی اور انگریزی صحافت رہی۔ لیکن 1997 میں یہ تیسرے نمبر پر آ گئی۔ آزادی کے بعد پہلے پچاس برسوں میں اخباروں کی تعداد و اشاعت میں سب سے زیادہ اضافہ آندھرا پردیش میں ہوا یعنی اٹھارہ گنا۔ اسی طرح بہار میں تیرہ، کرناٹک میں گیارہ، اتر پردیش میں چھ، مہاراشٹر اور مغربی بنگال میں پانچ پانچ اور دہلی میں

ساڑھے تین گنا اضافہ ہوا۔ اخباروں کی تعداد اشاعت کے اعتبار سے تقسیم ملک سے سب سے زیادہ نقصان دہلی، پنجاب اور اتر پردیش کو ہوا۔ 2002 کی آر این آئی رپورٹ کے مطابق سب سے زیادہ اخبارات، جرائد آندھرا پردیش سے 495 نکل رہے تھے اور سب سے کم چھتیس گڑھ سے صرف ایک اخبار۔ رپورٹ کے مطابق دہلی سے 488، جموں، کشمیر سے 251، مہاراشٹرا سے 218، بہار سے 159، کرناٹک سے 133، پنجاب سے 105 اور راجستھان سے 122 اخبارات نکل رہے تھے۔ مجموعی طور پر اخبارات و جرائد کی تعداد 2906 تھی جن میں سے 2625 اخبارات و جرائد پرائیویٹ تھے۔ 9 مرکزی حکومت کی ملکیت تھے۔ چودہ ٹرسٹ یا ریاستی حکومتوں کی ملکیت تھے، باقی اداروں، تنظیموں اور سوسائٹیوں کی ملکیت تھے۔ جبکہ پریس رجسٹرار کی 2005-6 کی رپورٹ کے مطابق تب آندھرا پردیش میں رجسٹرڈ اردو اخباروں کی تعداد 510 ہے اور پورے ملک میں اردو اخباروں کی مجموعی رجسٹرڈ تعداد 3126 ہے۔ جبکہ تمام زبانوں کے اخباروں کی تعداد 62 ہزار 483 ہے۔ ملک بھر سے جو اردو روزنامہ اخبارات شائع ہوتے ہیں ان میں چند قابل ذکر یہ ہیں۔ راشٹریہ سہارا، انقلاب، ہمارا سماج، ہندوستان ایکسپریس، صحافت، اخبار مشرق، جدید میل، ملاپ، پرتاپ اور جدید خبر (دہلی)۔ اودھ نامہ، آگ، قومی خبریں، انقلاب اور راشٹریہ سہارا (لکھنؤ)۔ انقلاب، صحافت اور اردو ٹائمز (ممبئی)۔ قومی تنظیم اور پندار (پٹنہ)۔ فاروقی تنظیم (رانچی)۔ منصف، سیاست، رہنمائے دکن اور اعتماد (حیدرآباد)۔ اخبار مشرق اور عکاس (کلکتہ)۔ [illegible] (بھوپال)۔ سالار، سیاست، راشٹریہ سہارا اور پاسبان (بنگلور)۔ ہند سماچار (چنڈی گڑھ)۔ کشمیر عظمیٰ، چٹان، اڑان اور بلند کشمیر (جموں و کشمیر)۔ مسلمان (چنئی) اور ورنگ آباد ٹائمز اور ایشیا ایکسپریس (اورنگ آباد)۔

اوپر اردو اخبارات و رسائل کی جو تعداد بتائی گئی ہے یعنی 3126 وہ سرکاری ہے اور 2005-6 کی رپورٹ کے مطابق ہے۔ اس کے بعد بھی اردو اخباروں اور جریدوں کی تعداد اشاعت میں مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ جب کوئی اخبار رجسٹرڈ کیا جاتا ہے تو کچھ عرصے بعد اسے سرکاری اشتہارات ملنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کے قواعد و ضوابط سخت ہیں۔ اردو اخباروں کے لیے کم از کم چھ ماہ کی فائل جمع کرنی ہوتی ہے۔ اس کے بعد بھی سرکاری اشتہارات کے ادارے ڈی اے

ڈی پی سے اخبار کا منظور ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہت سے اخبارات و رسائل برسوں تک شائع ہونے کے بعد بھی ڈی اے وی پی سے منظور نہیں ہو پاتے۔ اس وقت دہلی میں ڈی اے وی پی سے منظور شدہ روزنامہ اخباروں کی تعداد پچاس سے اوپر ہے۔ کچھ لوگ اس کی تعداد سو سے اوپر بتاتے ہیں۔

دہلی سمیت پورے ملک سے متعدد مذہبی رسائل و جرائد بھی شائع ہوتے ہیں۔ ہر بڑا اور متوسط مدرسہ اپنا ترجمان نکالتا ہے۔ بیشتر مذہبی تنظیمیں بھی اپنا ترجمان نکالتی ہیں۔ اس سلسلے میں قمر احمد رؤف نے ایک سروے کیا ہے جس کے مطابق دہلی سے تیس مذہبی رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں، جن میں الاسلام، جریدہ ترجمان، زندگی نو، نوائے اسلام، جام نور، ماہ نور، ترجمان دارالعلوم، اہل سنت کا پیغام، رفیق منزل، کنز الایمان، ہدیٰ، ذکریٰ، التبیان اور منادی قابل ذکر ہیں۔ اترپردیش سے تقریباً 70 مذہبی پرچے نکلتے ہیں، جن میں تعمیر حیات، معارف، محدث، اشرفیہ، شاہراہ اسلام، شعاع عمل، نئی دنیا، ترجمان دیوبند، محدث عصر، ضیائے وجیہ، الحسنات، الفرقان، تحقیقات اسلامی، ندائے شاہی، مشیر عصر اور تذکیر قابل ذکر ہیں۔ اسی طرح مہاراشٹرا سے 15، مدھیہ پردیش سے 10، بہار سے 9، جموں و کشمیر سے آٹھ، کلکتہ سے دو، اڑیسہ، راجستھان، ہریانہ، گجرات، اور مدھیہ پردیش سے ایک ایک، مالیرکوٹلہ سے ایک اور تمل ناڈو سے دو مذہبی پرچے نکلتے ہیں۔ یہ وہ رسائل و جرائد ہیں جو برابر نکل رہے ہیں۔ جو نکل کر بند ہوگئے ہیں وہ اس میں شامل نہیں ہیں۔ یہ تعداد 160 کے آس پاس ہے اور یہ فہرست نامکمل ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ملک بھر سے مذہبی رسالوں کی تعداد دو سو کے آس پاس ہوگی یا اس سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ حلیم وسیم اعظمی کی تحقیق کے مطابق غیر منقسم ہندوستان اور موجودہ ہندوستان و پاکستان میں اردو کے علمی رسائل کی تعداد تین سو تک پہنچتی ہے۔ اس فہرست میں جن علمی رسائل کو شامل کیا گیا ہے ان میں سے 136 پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ تحقیق 1842 سے لے کر اب تک کے رسائل پر مشتمل ہے۔ لیکن ان کی تحقیق کا یہ بھی کہنا ہے کہ اس وقت ہندوستان سے کل سات علمی رسالے نکل رہے ہیں۔ اس کے علاوہ سرکاری و پرائیویٹ سطح پر ادبی رسالے بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ سرکاری ادبی رسالوں میں آجکل، اردو دنیا، ایوان اردو، دہلی، ہماری

زبان و ادب، فکر و تحقیق (نئی دہلی)۔ نیا دور (لکھنؤ) اور جمنا تٹ (چنڈی گڑھ) شامل ہیں۔
غیر ادبی رسالوں میں یوجنا، سائنس کی دنیا اور سینک سماچار نئی دہلی سے نکلتے ہیں۔ سرکاری ادبی
رسائل و جرائد کی تعداد پچیس کے آس پاس ہے۔ یہ جرائد ریاستی اردو اکیڈمیوں اور دوسرے
سرکاری اداروں سے شائع ہوتے ہیں۔ جبکہ پرائیویٹ ادبی رسائل و جرائد کی تعداد اس سے کئی گنا
زیادہ ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ان کی تعداد ڈیڑھ سو سے کم نہیں ہوگی، جن میں شاعر،
کتاب نما، نیا ورق، تکمیل، اور تحریر نو (ممبئی)، اسباق (پونہ)، فنون (اورنگ آباد)، امکان اور ادیب
(لکھنؤ)، تمثیل نو اور جہان اردو (دربھنگہ)، انتساب (سرونج)، رنگ (دھنباد)، ذہن جدید، ادب
ساز، جہان غالب اور عالمی اردو ادب (دہلی)، جوش بانی (الہ آباد)، مژگاں (کلکتہ) اور صدا
(جموں و کشمیر) قابل ذکر ہیں۔ اس طرح ہندوستان بھر سے شائع ہونے والے اردو کے روزنامہ
اخبارات اور رسائل و جرائد کی مجموعی تعداد ساڑھے تین ہزار سے اوپر پہنچتی ہے۔ ان میں سے کچھ
اخبارات ایسے ہیں جو ایک سے زائد مقامات سے شائع ہوتے ہیں۔

ملازمین کی ضرورت

جب اتنی بڑی تعداد میں اخبارات اور رسائل و جرائد شائع ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کا
عملہ بھی ہوگا۔ اپنے آپ ہی شائع نہیں ہو جاتے ہوں گے۔ اگر ہم ایک اوسط روزنامہ اخبار کی بات
کریں تو اس میں ایک ایڈیٹر، ایک نیوز ایڈیٹر، دو چیف سب ایڈیٹر، ایک بیورو چیف، دو سب
ایڈیٹر، دو ٹرانسلیٹر، چار رپورٹر، چھ کمپیوٹر آپریٹر، دو پروف ریڈر، ایک منیجر، ایک اشتہارات منیجر،
ایک اکاؤنٹینٹ اور دو چپراسیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یعنی کم از کم 27 افراد۔ یہ بہت ہی محتاط تعداد
ہے۔ ویسے کچھ چھوٹے اخبارات اس سے نصف ملازمین سے ہی اپنا کام چلا لیتے ہیں، جبکہ
بڑے اخباروں میں اس سے کہیں زیادہ ملازمین کی ضرورت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر اس وقت
تعداد اشاعت کے اعتبار سے راشٹریہ سہارا ہندوستان کا غالباً سب سے بڑا اخبار ہے۔ غالباً اس
لیے کہ ابھی چند دنوں پہلے تک سرکولیشن کے اعتبار سے جالندھر سے شائع ہونے والا اردو روزنامہ
"پنجاب کیسری" سب سے بڑا اخبار تھا۔ راشٹریہ سہارا کے نوئیڈا دفتر سے ایک روزنامہ، ایک

ہفت روزہ اور ایک ماہنامہ شائع ہوتے ہیں۔ ان تینوں میں ملازمین کی مجموعی تعداد ایک سو سے اوپر ہے۔ دہلی اور مغربی اتر پردیش اور مضافات میں اس کے نامہ نگاروں کی تعداد بھی کافی ہے۔ اسی طرح جب دہلی سے روزنامہ قومی آواز شائع ہو رہا تھا تو اس میں آخری دنوں میں بھی تقریباً ساٹھ افراد ملازمت کرتے تھے، جن میں سرکولیشن اور اشتہارات کا عملہ الگ تھا۔ اس وقت ملک بھر میں جو اردو اخبارات شائع ہو رہے ہیں اور جن کی تعداد سرکاری رپورٹ کے مطابق تین ہزار سے زائد ہے، اگر ان میں سے نصف کو ہی ہم اوسط درجے کے اخبار مان لیں تو ایک اخبار میں کم از کم 25 ملازمین کام کرتے ہوں گے۔ چھوٹے اخباروں میں یہ تعداد کچھ کم ہوگی۔ ان اخباروں میں سرکاری و غیر سرکاری اشتہارات بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے لیے ملک میں اشتہاروں کی متعدد ایجنسیاں ہیں جو صرف اردو اخباروں ہی کے لیے اشتہارات کے کام کرتی ہیں۔ یہ اخبارات شائع ہوتے ہیں تو ظاہر ہے پڑھے بھی جاتے ہیں اور اس سے پہلے ان کی پرنٹنگ بھی ہوتی ہے۔ کئی اخباروں کے اپنے پرنٹنگ پریس ہیں جن میں متعدد لوگ کام کرتے ہیں۔ باقی ایسے ہیں جو دوسرے پریسوں میں اپنا اخبار چھپواتے ہیں۔ پرنٹنگ کے بعد یہ اخبار سینٹروں پر بھیجے جاتے ہیں۔ وہاں سے مختلف علاقوں میں پہنچائے جاتے ہیں اور اس کے لیے ہاکروں کی بڑی تعداد درکار ہوتی ہے۔ اگرچہ یہ ایک جزوقتی کام ہے لیکن اس سے انکار نہیں کہ یہ کام بھی روزگار کا ایک حصہ ہے اور اردو اخبار بھی ہاکروں کے ذریعے ہی گھروں میں ڈالے جاتے ہیں۔ قصبوں اور دور دراز کے گاؤں میں ہاکر سائیکل اور موٹر سائیکل کے ذریعے دور دور تک خبر لے جاتے ہیں۔ اگر ہم وسیع تناظر میں دیکھیں تو اخبار کی اشاعت کے لیے خام میٹیریل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ اس میں بھی بہت سے لوگ کھپ جاتے ہیں۔ ان اردو اخباروں میں خبروں کی ترسیل کے لیے متعدد نیوز ایجنسیاں ہیں ان میں بھی بہت سے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ حکومت کی عنایت سے دہلی سے یو این آئی کی اردو سروس بھی چل رہی ہے اور اگر اردو اخبار بند ہو جائیں تو وہ بھی بند ہو جائے گی اور اس کے ملازمین کے سامنے روزی روٹی کا مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔

لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ملک میں ایسے اردو اخبارات بھی نکلتے ہیں جو ڈمی ہوتے ہیں اور جو محض اشتہاروں کے لیے نکالے جاتے ہیں۔ وہ صرف فائلنگ کے لیے

ہوتے ہیں اس لیے ان میں زیادہ ملازمین کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ایسے ڈمی اخبار بھی نکلتے ہیں کہ ان کے مالکان خود دوسرے اخباروں میں کام کرتے ہیں جہاں وہ سب ایڈیٹر یا کمپیوٹر آپریٹر ہوتے ہیں یا ان کا بنیادی ذریعۂ معاش کچھ اور ہوتا ہے لیکن وہ اپنے اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر بھی ہوتے ہیں۔ ان کے پاس میں چیف ایڈیٹر کا خوبصورت سا کارڈ بھی ہوتا ہے جسے وہ بوقت ضرورت استعمال کرتے اور فائدے اٹھاتے ہیں۔ اس قسم کے اخبارات حکومت سے ملنے والی مراعات اور مفادات میں ان ایجنٹوں کو شامل کر لیتے ہیں جو ان کی فراہمی کا کام کرتے ہیں اور جن کا کمیشن طے ہوتا ہے۔ ان کا شمار بھی اردو اخباروں ہی میں ہوتا ہے۔ چھوٹے اخبارات یو این آئی اردو سے بیشتر ایجنسی خبریں لے کر اور دو تین تجربہ کار کمپیوٹر آپریٹر رکھ کر اخبار نکال لیتے ہیں۔ ان کو ایڈیٹر اور دوسرے کام کرنے والوں کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ انٹرنیٹ نے ایسے لوگوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا ہے۔ یہ اخبارات مختلف اخباروں میں شائع مضامین کو انٹرنیٹ سے لے لیتے ہیں اور اپنے اخبار کا پیٹ بھر دیتے ہیں۔ چونکہ یہ اخبار اسٹالوں پر نہیں جاتے، قارئین کے پاس نہیں جاتے لہٰذا ان کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم نہیں ہو پاتا۔ دہلی سے سو سے اوپر روزنامہ اخبار شائع ہوتے ہیں لیکن مارکیٹ میں چند ہی ہیں۔ اگر کسی اردو قاری سے دس اخباروں کے نام معلوم کیجیے تو وہ نہیں بتا سکتا۔ خود اخباروں میں کام کرنے والے ہی نہیں بتا سکتے۔ بہر حال یہ صورت حال صرف اردو صحافت میں نہیں ہے، دوسری زبانوں کی صحافت میں بھی ایسے ڈمی اخباروں کی کمی نہیں ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم انھیں نظر انداز کر دیں اور انھیں اردو صحافت کے کھاتے میں شمار نہ کریں۔ کیونکہ بہر حال ان اخباروں میں بھی کچھ نہ کچھ لوگ تو کام کرتے ہی ہیں اور ان کی ملازمتوں کو بھی اردو اخباروں کے کریڈٹ میں شامل کرنا پڑے گا۔ اسی طرح مذہبی رسالوں میں بھی کچھ نہ کچھ لوگ کام کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کے ایڈیٹر زیادہ تر مدارس کے اساتذہ یا مذہبی تنظیموں کے کارکن ہی ہوتے ہیں لیکن پروف ریڈنگ اور دوسرے کاموں کے لیے بھی اضافی افراد کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہندوستان کے علاوہ ان غیر ممالک سے بھی اردو کے اخبارات و رسائل شائع ہوتے ہیں جن کو اردو کی نئی بستیاں کہا جاتا ہے۔ ان میں سیاسی اخبارات بھی ہیں اور ادبی جریدے بھی۔ ادبی جریدوں کی تعداد زیادہ ہے۔ غیر ممالک سے اردو کے مذہبی

رسالے بھی شائع ہوتے ہیں۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب کے نتیجے میں اب رفتہ رفتہ آن لائن رسائل وجرائد بھی شائع ہونے لگے ہیں اور ایسے جریدوں کے لیے انٹرنیٹ کے علم کی ضرورت ہے۔ اردو والے بھی اس میں کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔

اس طرح اس جائزے کی روشنی میں ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ اردو اخبارات ورسائل کا رشتہ روزی روٹی سے قائم ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ دوسری زبانوں کی صحافت کی مانند اردو صحافت میں تنخواہیں کم ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دوسری زبانوں کی صحافت میں کام کرنے کے لیے جن تعلیمی وفنی ڈگریوں کی ضرورت ہوتی ہے اردو میں ان کے بغیر بھی کام چل جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ جو فنی تعلیم سے آراستہ ہوں اور اردو صحافت سے جڑنا چاہتے ہوں وہ بھی اس میں کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ بات خلاف حقیقت ہے کہ اردو صحافت کا دامن روزگار اور ملازمت سے بالکل خالی ہے۔ اردو والے آج بھی دوسری زبانوں کے اخبارات کے قافلے میں شامل ہیں اور پیچھے ہیں لیکن کم نہیں ہیں۔ انہیں روزگار سے یکسر خارج کر دینا حقیقت سے منہ موڑنے کے مترادف ہے۔ تنگ نظری کے اس خول سے باہر آنے اور حقیقت میں [illegible]

اخبار میں اداریہ نویسی کی اہمیت

کسی بھی اخبار میں اداریے کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر اخبار ادھورا ہوتا ہے۔ اداریہ کسی ہنگامی واقعے یا کسی اہم موضوع پر مدیر کا تحریر شدہ جامع اور مبسوط مقالہ ہوتا ہے جو اخباری پالیسیوں کو ذہن میں رکھ کر تحریر کیا جاتا ہے اور جس کے حوالے سے اس مخصوص واقعے کے بارے میں اخباری رائے قارئین تک پہنچتی ہے۔

کیف فریڈ بلنڈ کا کہنا ہے کہ ”اداریہ ایک ایسا مضمون ہوتا ہے جو ہنگامی اہمیت کا مظہر ہوتا ہے۔ اس ہنگامی مضمون کا مقصد اخباری رائے کا اظہار ہے۔“ کارل جی مرے کے خیال میں ”اداریے ایسے مضمون ہوتے ہیں جو کسی ہنگامی موضوع پر لکھے گئے ہوں اور جس میں قاری کی سوچ کو ایک راہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہو جو مضمون نگار کی رائے میں صحیح ہو۔ اداریہ نویس قاری کو اپنے نقطہ نظر سے متفق کرنے کی کوشش کرتا ہے اور ایسی باتیں لکھتا ہے جن سے قاری قائل ہو جائے اور موافق رائے ظاہر کرے۔“ میکس طر کا کہنا ہے ”اداریہ ان رجحانات پر تبصرے کا نام ہے جو روزمرہ واقعات کی تہہ میں کارفرما ہوتے ہیں۔ یہ ایک ایسا مضمون ہوتا ہے جو مدیر کی رائے ظاہر کرنے یا قاری کو متاثر کرنے کے لیے حقائق اور نقطہ نظر کو منطقی اور خوش اسلوبی سے پیش کرنے کا نام ہے یا ایسی خبروں کی تشریح اور وضاحت ہے جس سے تمام قارئین کی توجہ واضح طور پر کھینچیں۔“ ایمری اور بلنڈ کے بیان میں ”اداریہ اخبار کی طرف سے کسی ہنگامی موضوع پر بحث میں حصہ لینے یا بحث کا آغاز کرتے ہیں۔“

ان تعریفات سے ثابت ہوتا ہے کہ اداریہ دراصل کسی ہنگامی یا وقتی مضمون پر مدیر یا اداریہ نویس کی رائے ہوتی ہے۔ اس میں اخباری رائے بیان نہیں کی جاتی اور قاری سے اپنی بات کو

عنوانات سے ہٹے استدلالی اور پختہ انداز بیان اختیار کیا جاتا ہے۔ مدیر اپنے اداریہ کی مدد سے کسی مخصوص واقعے کو ایک خاص تناظر میں دیکھتا ہے اور اسی تناظر میں قارئین کو بھی دکھانا چاہتا ہے۔ مضمون طویل ہوتا ہے اور اداریہ مختصر ہوتا ہے۔ اختصار ہی اداریے کی خوبی ہے۔ مضمون جہاں دو یا چار صفحات پر مشتمل ہوتا ہے وہیں اداریہ ایک کالم یا دو کالم کا ہوتا ہے اور اس میں وہ تمام نکتے شامل کیے جاتے ہیں جو اداریہ نویس قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہے۔ گویا اداریہ نویس ایک ایسا درزی ہوتا ہے جو ایک مختصر کپڑے کو کاٹ چھانٹ کر ایک مخصوص جسم کے مطابق بنا دیتا ہے۔ اداریہ تحریر کرنے سے قبل اداریہ نویس کے لیے لازم ہے کہ وہ اہم نکات کا تعین کرے اور انہی کی روشنی میں اداریہ لکھا جائے۔ اس کے ذہن میں یہ واضح ہونا چاہیے کہ اسے کن نکات کو ابھارنا ہے اور کن نکات سے اس کی اپنی بات محدود ہو سکتی ہے۔ اداریہ نویس ایک خاص سوچ کو اپنی تحریر میں ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ دوسری غیر متعلق اور غیر ضروری چیزوں سے اجتناب کرتا ہے۔ وہ اپنی تحریر میں مخالفین کی رائے کا جواب دینے کے بجائے اپنی بات کو مدلل انداز میں رکھنے کو ترجیح دیتا ہے۔ البتہ بر سبیل تذکرہ مخالفین کی رائے کا جواب دینا پڑے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی محض اشاروں اور کنایوں میں ہونا چاہیے۔ اداریہ موضوعاتی ہوتا ہے معروضی نہیں۔ اداریہ نویس کے لیے ضروری ہے کہ اسے زبان پر عبور حاصل ہو اور وہ جس موضوع پر اداریہ تحریر کرنے جا رہا ہو اس کا اس نے بنظر غائر مطالعہ کیا ہو۔ مدیر کے لیے لازم ہے کہ وہ کم لکھے مگر اچھا لکھے۔ اور اس انداز سے لکھے کہ اس کی باتیں قاری کے دل میں براہ راست اترتی چلی جائیں۔ گویا اداریہ نویسی دریا کو کوزے میں بند کرنے کا نام ہے۔ اداریہ کا کام وہی انجام دے سکتا ہے جو دریا کی گہرائی و گیرائی سے واقف ہو اور کوزے کی تنگ دامانی سے بھی۔ اس بات کا بھی خیال رکھنا ضروری ہے کہ دریا کوزے میں بند ہونے کے باوجود دریا ہی رہے کوزہ نہ بن جائے۔

اردو اخبارات میں عام طور پر ایک ہی موضوع پر یعنی ایک ہی اداریہ ہوتا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اردو اخبار کے مدیر ہی اداریہ تحریر کرتے ہیں، اسی لیے وہ ایک سے زائد موضوعات پر قلم برداشتہ لکھنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ عموماً اردو اخبارات ایک اداریے کے لیے جتنی جگہ دیتے ہیں انگریزی اخبارات میں اتنی ہی جگہ میں دو تین اداریے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے

کہ بعض اوقات اردو اداریوں میں بہت سی غیر ضروری باتیں آجاتی ہیں جو تحریر کو بوجھل اور عجیب بنا دیتی ہیں۔ انگریزی اخبار میں ایسا نہیں ہوتا۔ وہاں اداریہ تحریر کرنے والوں کا ایک پینل ہوتا ہے جبکہ اردو اخباروں میں ایک ہی شخص سیاسی اداریہ بھی لکھتا ہے، فلمی بھی لکھتا ہے، اقتصادیات پر بھی لکھتا ہے، کھیل کود پر بھی لکھتا ہے اور سماجی امور پر بھی لکھتا ہے۔ تاہم اردو کے بعض اخباروں نے یہ روایت قائم کی ہے کہ وہ ہفتہ بھر کام کرنے والے تمام سب ایڈیٹروں سے اداریے لکھواتے ہیں۔ دراصل اردو اخبارات میں بھی ماہرین کا ایک پینل ہونا چاہیے۔ اداریہ تحریر کرنے سے قبل وہ پینل آپس میں مشورہ کرے اور موضوع طے کرے۔ یہ بھی طے کرے کہ کن نکات کو ابھارنا ہے، کن کو دبانا ہے اور کن نکات کی بنیاد پر بات آگے بڑھانی ہے۔ کسی شخص کا انتخاب کیا جائے جس سے اداریہ لکھوایا جائے۔ جب وہ لکھ لے تو اخبار کا مدیر اس پر نظر ثانی کرے۔ اگر ضروری ہو تو اس کی نوک پلک سنوارے اور اگر کسی نکتے پر اداریہ اخبار کی پالیسی سے ہٹ کر جا رہا ہو تو اس کو درست کرے۔ اس کے بعد ہی اسے اشاعت کے لیے بھیجے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ جن لوگوں سے اداریے لکھوائے جائیں پہلے ان کی تربیت کی جائے اور جب وہ اداریہ نویسی کے فن میں حاذق ہو جائیں تبھی انھیں یہ ذمہ داری سونپی جائے۔ جن دنوں اردو کے معروف صحافی حیات اللہ انصاری اور عشرت علی صدیقی روزنامہ قومی آواز کے مدیر ہوا کرتے تھے اس زمانے میں انھوں نے اس کی ایک روایت شروع کی تھی۔ قومی آواز دہلی کے ایڈیٹر عشرت علی صدیقی پورے ایک سال تک بعد میں اخبار کے ایڈیٹر ہونے والے موہن چراغی سے اداریے لکھواتے رہے۔ موہن چراغی نے راقم الحروف کو بتایا تھا کہ وہ اداریے لکھتے، عشرت علی صدیقی ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کی نشاندہی اور اصلاح کرتے اور پھر پھاڑ کر ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیتے۔ ایک سال کی مشق کے بعد انھوں نے موہن چراغی کی تحریر کو اس لائق سمجھا کہ اسے اداریہ بنایا جا سکے۔

اداریے کے لیے ایک جگہ مخصوص ہوتی ہے اور اسے ہمیشہ اسی جگہ پر ہونا چاہیے۔ اداریہ عموماً ادارتی صفحہ پر ہوتا ہے جہاں اہم مضامین بھی ہوتے ہیں۔ تاہم بہت خاص مواقع پر صفحہ اول پر بھی اداریہ شائع ہوتا ہے جیسے پنڈت نہرو کی موت، اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کے قتل، بابری مسجد کے انہدام، سابرمتی ایکسپریس میں آتش زنی اور گجرات فسادات

دفعہ بیشتر اخباروں نے صفحۂ اول پر اداریہ شائع کیا تھا۔

یہ قاری کو چاہیے کہ وہ زیادہ سے زیادہ اخبارات کے اداریے پڑھے تاکہ اس کی معلومات مکمل رہیں۔ بالفاظ دیگر ایک قاری کو پوری طرح باخبر ضرور ہونا چاہیے اور قومی و بین قومی حالات پر اس کی گہری نظر ہونی چاہیے۔ اس ضمن میں اگر انگریزی اور اردو کے اخباروں کے قارئین کا موازنہ کیا جائے تو یہ حقیقت انگیز انکشاف ہوگا کہ جہاں انگریزی کے قارئین اداریہ خوانی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے وہیں اردو کے قارئین چھوٹے چھوٹے چائے خانوں میں بیٹھ کر نہ صرف اردو اخبارات پڑھتے ہیں اور ساتھ میں اداریے بھی پڑھتے ہیں بلکہ علاوہ ازیں اس کے مختلف پہلوؤں پر بحث بھی کرتے ہیں۔ قصبوں اور دیہاتوں میں یہ روایت بہت پرانی ہے اور بہت سی جگہوں پر اب بھی قائم ہے۔ اردو اخبارات کے قارئین اپنے مدیروں کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں ان کی ہر بات کو صداقت پر مبنی سمجھتے ہیں خواہ اس میں دروغ بیانی اور مبالغہ آرائی ہی کیوں نہ ہو۔ وہ مدیروں سے عقیدت بھی رکھتے ہیں اور ان کے خلاف کچھ سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ اپنے پسندیدہ اخباروں کے مدیروں کو خطوط لکھ کر مشورہ بھی دیتے ہیں کہ فلاں موضوع پر اداریہ لکھا جائے۔ اردو کے ہفت روزہ اخباروں کی بات کی جائے تو بنگلور سے شائع ہونے والے اخبار "نشیمن" کی مثال دی جا سکتی ہے۔ جن دنوں [illegible] کے خلاف قتل کا مقدمہ چل رہا تھا، "نشیمن" کی اشاعت [illegible]۔ "نشیمن" کے ایڈیٹر [illegible] قسط [illegible] قارئین ابھی بھی نہیں [illegible] قارئین اس کے منتظر رہتے [illegible] جواب دیتے ہیں [illegible] تو [illegible] جواب نکال کر لاتے ہیں۔ اس چشمک نے جہاں اداریہ نویسی کے میدان میں ایک نئی شروعات کی تھی وہیں اس نے دونوں اخبارات کی تعداد اشاعت میں بھی زبردست اضافہ کر دیا تھا۔

اردو اخبارات کے اداریے مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں اور بعض دفعہ قسط وار لکھے جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند برسوں قبل دہلی سے شائع ہونے والے روزنامہ "فیصل جدید" کی مثال دی جا

حقی ہے۔ اس کے مدیر احسن ایم عثمان اتنے طویل اداریے لکھتے تھے کہ اس کے اوپر لکھا ہوتا تھا ''کل کا بقیہ'' اور آخر میں لکھا ہوتا تھا ''بقیہ کل''۔ اداریے کی زبان اور معیار سے قطع نظر قارئین بہت دلچسپی سے وہ اداریے پڑھا کرتے تھے۔ یہاں ایک مذہبی رسالہ ''التوحید'' کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو مرزا ابوالکلام آزاد جوگا پتی دہلی سے کئی برسوں تک شائع ہونے کے بعد بند ہو چکا ہے۔ وہ رسالہ بڑی تقطیع پر نکلتا تھا اور اس کے اداریے پندرہ بیس اور پچیس صفحات کے ہوتے تھے اور اس کے قارئین بہت دلچسپی کے ساتھ سے پڑھا کرتے تھے۔ دراصل انگریزی اور اردو زبان میں بنیادی فرق انداز تحریر کا ہے۔ انگریزی کا انداز الگ ہے اور اردو کا الگ ہے۔ اردو کی جداگانہ طرز تحریر ہی اس کے اداریوں میں شیرینی اور مٹھاس پیدا کرتی ہے۔ امریکا سے ہفت روزہ ''اردو ٹائمز'' کے مدیر خلیل الرحمن نے ایک ملاقات میں راقم کو بتایا کہ ان کے اخبار کی اشاعت اسی ہزار (80,000) ہے اور قارئین کی نصف تعداد محض اخبار کا اداریہ پڑھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ خوبی اردو اسلوب نگارش ہی کی ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک کے اردو قارئین بھی اداریوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ اردو زبان کا خاصہ اور اس کی صحافت کا امتیازی وصف ہے۔ یہ خوبی شاید دوسری زبانوں کی صحافت میں نہیں ہے۔

اردو میں اداریوں کی ابتدا اخبارات سے ہوئی۔ ''دہلی اردو اخبار''، ''اودھ پنچ'' اور ''اخبار جمہور'' وغیرہ کے اداریے خاصے کی چیز ہوا کرتے تھے۔ جنگ آزادی کے دوران اخبارات کے اداریے مجاہدین کی رگوں میں دوڑنے والے خون میں حدت پیدا کر دیتے تھے اور عوام میں بھی ان اداریوں سے زبردست جوش پیدا ہوتا تھا۔ روزنامہ اخبارات میں ادبی اداریوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس کمی کو اردو کے ادبی رسائل نے پورا کر دیا۔ ادبی رسائل کے اداریوں میں اختصار کی کوئی قید نہیں ہے۔ ان میں عصری و ادبی مباحث پر اداریے تحریر کیے جاتے ہیں۔ ''کتاب نما'' کے سابق مدیر شاہد علی خاں نے ایک نئی روایت شروع کی تھی وہ دوسروں سے اداریے لکھواتے تھے۔ اسے مہمان اداریہ اور اداریہ نویس کو مہمان مدیر کہا جاتا تھا۔ یہ اداریہ کسی ادبی، صحافتی یا ثقافتی موضوع پر دراصل ایک مختصر مضمون ہوتا تھا جس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا فائدہ ''کتاب نما'' کے مدیر کو یہ ہوا کہ وہ اداریہ لکھنے سے بری الذمہ ہو گئے لیکن اس کی خرابی یہ تھی کہ اس میں کوئی

ایک مخصوص پالیسی میں اپنائی جا سکتی تھی۔ گزرا ہوتا تھا اور افرادی قوت کے فارمولے پر عمل کیا جاتا تھا۔ تاہم یہ اداریے بہت گراں قدر اور جامع ہوتے تھے اور کتاب نما کے مہمان مدیران میں شمس الرحمٰن فاروقی اور شمیم حنفی سمیت اردو کی متعدد قد آور شخصیات شامل رہی ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ پرنٹ میڈیا کی مانند الیکٹرانک میڈیا میں بھی اداریہ سازی یا اداریہ نویسی کی روایت ہے تو شاید آپ چونک پڑیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے۔ وائس آف امریکہ اردو سروس نے یہ روایت شروع کی ہے۔ وہ کسی خاص موضوع پر کسی خاص وقت امریکی حکومت کی پالیسیوں کے رنگ میں پیش کرتا ہے اور اس کا عنوان ہوتا ہے "امریکی حکومت کی پالیسیوں کا ترجمان" آن کا اداریہ ہے۔ بہرحال مجموعی اداریہ نویسی جیسی ایک بہت اہم فن ہے جس میں اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں اور صحافت کی تاریخ میں اداریہ نویسی کی افادیت و فوقیت ہمیشہ قائم رہے گی۔

صحافت کی معدوم ہوتی صنف: فیچر نگاری

صحافتی نثری اصناف میں فیچر نگاری کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اگر فیچر نویس اپنی وسعت مشاہدہ، تخیل، ذہنی وسعت اور معرفت، تشخیص سے کام لیتے ہوئے کوئی اچھا فیچر تحریر کرتا ہے تو وہ اس شعبہ کا ایک اہم ستون ہو سکتا ہے۔ فیچر نویسی ایک مشکل فن ہے لیکن اگر کسی صحافی یا قلم کار کو اس میں مہارت ہو جائے تو اس کے تحریر کردہ فیچر تو مقبول ہوں گے ہی فیچر نویس کی بھی شہرت بڑھ جائے گی۔ فیچر اور مضمون میں بہت فرق ہے۔ کوئی ضروری نہیں کہ جو شخص اچھا مدیر، اچھا مضمون نگار اور اچھا صحافی ہو وہ اچھا فیچر نویس بھی ہو۔ کیونکہ فنی انداز میں چھوٹی باتوں اور باریکیوں کا خیال رکھنا بہت ضروری ہوتا ہے۔ اگر ان کو نظر انداز کر دیا گیا تو عمدہ فیچر نگاری نہیں ہو سکتی۔ کوئی بھی مضمون جہاں سنجیدگی کا متقاضی ہوتا ہے، وہیں فیچر کے لیے دلچسپ اور پر لطف ہونا بہت ضروری ہے۔ مضمون کی عمارت جہاں تحقیق و تدقیق کی بنیاد پر کھڑی کی جاتی ہے، وہیں فیچر کی تعمیر مشاہدے اور وجدان کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ مضمون جہاں معلوماتی ادب کا نمائندہ ہوتا ہے، وہیں فیچر تفریحی ادب کا علمبردار ہوتا ہے۔ یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ تفریحی ادب بھی اردو زبان و ادب کے خزانے کا ایک گراں قدر حصہ ہے۔ اس لیے فیچر و تفریحی ادب کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اس کی اہمیت کم کی جا سکتی ہے۔

فیچر نگاری کے کچھ اصول ہیں جن کو اگر برتا نہیں گیا تو وہ مضمون تو بن سکتا ہے، فیچر نہیں۔ اس کے لیے قوت مشاہدہ ہونی چاہیے، گہری اور تیز نظر ہونی چاہیے۔ اس کی گہری نظر ایسی ہو جو کہ ہو بہو اس منظر کے پردے کو چاک کر کے کسی شے کے اندر چھپی کوئی خصوصیت دو سب تک پہنچا سکے۔ جب قوت مشاہدہ اپنا کام کرتی ہے تو وہ منظر بھی بے پردہ ہو جاتے ہیں جن

تب ہم نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتے ہیں۔ قوت مشاہدہ کے ساتھ ساتھ وجدان کی بھی بے حد ضرورت ہے۔ وجدان کے بغیر ہم فیچر نگاری کے معیار پر کھرے نہیں اتر سکتے۔ وجدان کو عملی شکل دینے کے لیے قلم میں بھی جان ہونی چاہیے۔ جب تک وجدان اور قلم کی جان باہم شیر و شکر نہیں ہوں گے قوت مشاہدہ کا ہونا مشکل ہو جائے گا۔ فیچر نویسی کے لیے اختصار اور ظرافت و شگفتگی کی بھی ضرورت ہے۔ اسے نہ تو مضمون کی مانند طویل ہونا چاہیے اور نہ ہی سنجیدہ، بے کیف اور بے لطف ہونا چاہیے۔ کم سے کم اور دلچسپ الفاظ میں اپنی بات کہنی چاہیے اور دلکش انداز بیان اختیار کرنا چاہیے۔ معنوی جامعیت اور اختصار، ثقیل الفاظ سے گریز اور شستہ و شگفتہ زبان و اختیار کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ جب الفاظ میں اختصار کے ساتھ اصل واقعہ بیان کر دیا جاتا ہے اور پھر زیادہ زیبائش کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ فیچر کے خاتمے میں اصل واقعہ بیان نہیں کیا جاتا، صرف اپنے ہم عصر میں ایک ندرت بیان ہونی چاہیے۔ قاری فوری طور پر اپنی گرفت میں لے لے اور وہ پوری تحریر پڑھنے پر مجبور ہو جائے۔ کیونکہ جب "گرفت مضبوط" ہوتی ہے تبھی فیچر میں کی اہمیت کی بنا پر کیونکہ اس کے ایک ہی پہلو کو مرکزیت حاصل ہوتی ہے یا ایک ہی نقطہ نظر کو بیان کیا جاتا ہے۔

فیچر میں عنوان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ تحقیق پسند لوگ کہتے ہیں کہ عنوان سے ہی منظر اور پیش منظر کی وضاحت اور مضمون کا خلاصہ نہیں رکھا جاتا ہے بلکہ عنوان سے تجسس پیدا ہوتا ہے۔ فیچر میں عنوان ہر کسی سے کام لیا جاتا ہے۔ اسے دلچسپ ہونا چاہیے اور پڑھنے میں خوبصورت ہونا چاہیے۔ مضمون نگاری کے لیے "عنوان" کی بہت زیادہ ضرورت نہیں ہوتی لیکن فیچر میں عنوان کی بڑی اہمیت ہے۔ اکثر فیچر کی روح اور طوالت اس سے طے ہوتی ہے۔ کیونکہ مضمون آمادہ کرنے والا ہوتا ہے، طبیعت گراں بار ہو جاتی ہے اور اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ فیچر میں تنوع ہونا چاہیے۔ اس میں نئے پہلو کی ضرورت ہے تاکہ قاری کی دلچسپی قائم رہے۔ فیچر کے ایک ایک رخ کو نمایاں کیا جاتا ہے اور اس کو اچھی طرح سے پیش کرنے کی ضرورت ذہن میں رکھنی چاہیے۔ اس میں مواد کے انتخاب کی بھی اہمیت ہے۔ مختلف ادوار کی مشکلات سامنے لائی جاتی ہیں لیکن وہ سب سے زیادہ اہم ہوں جو دلچسپی پیدا

کردیں۔ جملے پرلطف ہونے کے ساتھ ساتھ سلیس بھی ہونے چاہئیں اور تحریر میں حتی الوسع ثقالت سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اس میں کسی کے قول یا کوٹیشن کا بھی استعمال کیا جاتا ہے لیکن وہ قول یا کوٹیشن بھاری بھرکم ہونے کے بجائے ہلکا پھلکا ہونا چاہیے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ فیچر کا پہلا جز انفارمیشن ہے، ''خبریت'' سے وہ خالی نہیں ہونا چاہیے۔ دلکشی، شگفتگی کے ساتھ خبریت شامل کی جانی چاہیے۔ لیکن ایسا بھی نہ ہو کہ فیچر کسی اور موضوع پر ہو اور خبر کسی اور سمت میں جا رہی ہو۔ دلچسپ پیرایۂ بیان بھی اختیار کیا جائے۔ میں اس کی ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔ کچھ دنوں قبل ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ اور ذاکر حسین اسٹڈی سرکل کے زیر اہتمام سپریم کورٹ کے اس وقت کے جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے ''اردو وراثت'' کے عنوان سے جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ایک خطبہ پیش کیا تھا۔ خطبے کے اختتام پر ایک روزنامہ اخبار کے مدیر نے راقم الحروف سے کہا کہ انھیں اس کی رپورٹ چاہیے اور وہ تفصیلی ہی ہونی ہے۔ راقم نے اس خبر کا آغاز موضوع اور خطیب کی انفرادیت کے پیش نظر قدرے دلچسپ انداز میں کیا۔ آپ بھی ملاحظہ فرمائیں: ''سپریم کورٹ کے جج جسٹس مارکنڈے کاٹجو نے آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے [illegible] ہال میں اردو عدالت لگائی۔ لیکن انھوں نے فیصلہ نہیں سنایا بلکہ اردو کی وکالت کی اور اردو زبان کے ایک شیدائی کی حیثیت سے اس کا مقدمہ لڑا اور ایک وکیل کی حیثیت سے مدلل پیرائے میں بحث اور جرح کی۔ انھوں نے اس باوقار تقریب میں موجود معتبر ججوں اور وکلا حضرات سے درخواست کی کہ وہ بھی اس کی استدلال اور زبان کا تحفظ کریں اور جج حضرات اپنے فیصلوں میں اردو کے الفاظ اور اشعار کا خوب استعمال کریں۔'' اس اقتباس میں خبر کے پہلے پیراگراف میں عدالت، جج، وکیل، مقدمہ، بحث اور جرح جیسے الفاظ ایک خاص تناظر میں اور ان کی پوری معنویت کے ساتھ استعمال کیے گئے ہیں جس سے خبر کے پہلے پیراگراف میں انفرادیت آگئی، شگفتگی اور شگفتگی بھی آگئی اور دلچسپ پیرایۂ بیان بھی پیدا ہوگیا۔ اس خبر کو سیدھے سادے اور سپاٹ انداز میں بھی لکھا جا سکتا تھا لیکن اس صورت میں مذکورہ الفاظ کی معنویت اجاگر نہیں ہو پاتی۔

فیچر رائٹنگ میں اگر ان نکات کو بھی ذہن میں رکھا جائے تو اچھی فیچر اسٹوری تیار ہو سکتی ہے۔ ابتدائیہ اور اختتامیہ تو مضمون میں بھی ضروری ہوتے ہیں اور فیچر اسٹوری میں بھی۔ لیکن فیچر اسٹوری میں مزید چند پہلوؤں پر بھی توجہ دینی چاہیے۔ یہ ہیں تبدیلی فارم اور ڈکشن۔ ابتدائیہ کو لیڈ یا انٹرو کہا جاتا ہے۔ اس کا مقصد اپنے دلچسپ انداز بیان سے قاری کو اپنی گرفت میں لے لینا اور اسے پوری تحریر پڑھنے کے لیے مجبور کر دینا ہے۔ اس لیے اس میں منظر کاری کرتے وقت [illegible] معلومات [illegible] بھی استعمال [illegible] چاہیے۔ [illegible] ساتھ ہی موضوع کا تعارف بھی ہو جانا چاہیے۔ [illegible] اس لیے [illegible] میں [illegible] کے لیے [illegible] تبدیلی فارم [illegible] تسلسل میں [illegible] ہوتا ہے [illegible] میں رائٹنگ فارم میں تبدیلی [illegible] ہوتی ہے [illegible] قاری [illegible] افادیت [illegible] ہوتی ہے۔ اس کے لیے ریسرچ، [illegible] بیان کرنا ہوتا ہے کہ قاری بور بھی نہ ہو [illegible] ڈکشن کا ہے۔ اس کا مقصد بھی قاری کو باندھنا ہے۔ [illegible] فیچر [illegible] انٹرویو لیا گیا ہے تو قلم کار کو چاہیے کہ وہ انٹرویو کے [illegible] اور پورے انٹرویو میں سے وقت کے صرف [illegible] دلچسپ انداز میں [illegible] طور پر اگر [illegible] کرے [illegible] اور جملے کو [illegible] اختتامیہ بھی ابتدائیہ کی مانند [illegible] کوشش [illegible] چاہئے۔ آخری چند جملوں میں قاری پر ایک مخصوص تاثر پیدا ہونا چاہیے۔ [illegible] ایک [illegible] میں اپنے مضمون [illegible] ابتدائیہ [illegible] خوبصورت انداز میں [illegible]۔

ہندوستانی زبانوں میں بالخصوص اردو صحافت میں فیچر کی صنف کافی قدیم نہیں ہے جبکہ
امریکہ اور مغربی ملکوں کی صحافت میں اس کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ اخبارات کے ضمیموں میں
ان کو نمایاں انداز میں شائع کیا جاتا ہے۔ مغربی ملکوں میں فیچر ایجنسیاں ہوتی ہیں جو اخبارات کو
مختلف موضوعات پر فیچر فراہم کرتی ہیں۔ ہندوستان میں انگریزی صحافت میں فیچر کی صنف
سے بہت پہلے سے [illegible] ہے۔ خاص طور سے اتوار کے ایڈیشنوں میں [illegible] سکتا
ہے۔ انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمز کے اتوار کے ایڈیشن میں [illegible] ہیں فیچر
دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح [illegible] انگریزی اور ہندی
روزناموں میں بھی ہفتہ واری ضمیموں میں یہ اہتمام ہوتا ہے۔ لیکن اردو کے اخبارات جو ہفتے
میں ایک بار ضمیمہ شائع کرتے ہیں وہ بھی فیچر کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ [illegible]
ہندوستان میں چونکہ انگریزی دور حکومت کے خاتمے کے بعد [illegible]
میں اردو روزنامہ اخباروں کا جنم ہوا ہے اس لیے ان میں سنجیدہ مضامین کی بہتات ہوتی ہے جو
چھپتے ضرور ہیں لیکن [illegible] حقیقت نہیں [illegible] پاکستان کی
اردو صحافت کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں [illegible]
[illegible]
[illegible] ہندوستان میں [illegible] پاکستان [illegible]
اخبارات میں فیچر [illegible] شائع ہوتے ہیں اور ہندوستان [illegible]
جب دلی سے روزنامہ قومی آواز شائع ہوتا تھا اس میں فیچر [illegible] روزنامہ اخبار
میں بھی [illegible]
بھی [illegible] بند ہو گیا تھا۔

یہاں میں پاکستان سے شائع ہونے والے سب سے بڑے اخبار روزنامہ جنگ کے
ہفتہ وار ایڈیشن "سنڈے میگزین" کا ایک [illegible] خواتین
کی پسند اور ان کے ذوق و شوق پر ایک فیچر شائع ہوتا ہے [illegible]
[illegible] خواتین ہر معاملے میں خوب سے

خوب ترقی کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں۔ کبھی انھیں گھر چلانے کی فکر لاحق ہوتی ہے، کبھی فرنیچر کو جدید رنگ دینے کا خیال آتا ہے، کبھی کچن کے لیے نئے اسٹائل کے برتنوں کے بھاؤ تاؤ کرتی نظر آتی ہیں تو کبھی میڈیا کی چکاچوند سے متاثر ہو کر کچھ نیا کر گزرنے کا خیال دل میں دستک دیتا رہتا ہے اور وہ ہر ممکن ہیں تو دوسروں کے ساتھ مسابقت میں آگے بڑھ جانے کے خواب کو حقیقت کا رنگ دینے کے لیے کوشاں رہتی ہیں"۔

فیچر نگاری کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ شرط صرف دیدۂ بینا کی ہے۔ جہاں بڑے موضوعات کو فیچر کا موضوع بنایا جا سکتا ہے وہیں چھوٹی چھوٹی چیزوں کو بھی بنایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آج کل پیزا، برگر اور موموز کھانے کا چلن ہے۔ آپ کسی گلی میں چلے جائیں آپ کو ان کے شوقین بڑی تعداد میں مل جائیں گے۔ آپ ان سے بات کریں، اسٹالوں کے مالکوں سے بات کریں یا پھر ان کے کاروبار کے حوالے سے موموز بیچنے اور خریدنے والوں سے گفتگو کر کے فیچر تیار کر سکتے ہیں۔ یا پھر ایک مستقل عنوان کے تحت بھی فیچر نگاری کی جا سکتی ہے۔ مثال کے طور پر کالونی کے کسی پڑوس کے دبے کچلے اور محروم طبقات کے مسائل کو بھی موضوع بنایا جا سکتا ہے۔ جیسے ایک مستقل فیچر کا عنوان رکھا جا سکتا ہے "ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں" اور پھر کسی ہفتے رکشا والوں، چوکیداروں کی، کسی ہفتے ریڑھی والوں، چوکیداروں کی، کسی ہفتے مساجد کے ائمہ اور مؤذنوں یا معلمین، مدرسین کی اور کسی ہفتے دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ سے بات کر کے ان کے مسائل سے واقفیت حاصل کر کے ایک فیچر تیار کریں۔ کسی ہفتے مزدوروں، گلیوں میں جھاڑو لگانے والوں سے ملاقات کر کے کسی ہفتے میں اخبار بیچنے والوں کے مسائل معلوم کریں۔ کبھی شادیوں میں کھانا بنانے والوں، باورچیوں اور کھانے سے پہلے مہمانوں کی ضیافت میں سرگرم ویٹروں سے بات کر کے فیچر لکھے۔ فیچر کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے، ضرورت ان کو تلاش کرنے کی ہے۔ یہ کام وہی کر سکتا ہے جس کا مشاہدہ وسیع ہو، جو وقت کی نبض پہچانتا ہو اور جسے حسِ شگفتگی، تجسس اور منفرد زبان لکھنے کی مہارت ہو۔ اس کے لیے تھوڑی سی محنت کی ضرورت ہے۔ ورنہ میں کا کوئی ضرورت نہیں بلکہ ان معمولی شے میں بھی غیر معمولی خصوصیات کا ادراک کر لینے والی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اس [illegible] روایتی موضوعات بھی موجود ہیں [illegible] جیسے [illegible]

[illegible] تاریخی، ثقافتی، [illegible] سیاسی [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

پرانے شخص سے اس بارے میں بات کر سکتے ہیں [illegible] کے خطوط سے متعلق ذاتی

[illegible] پوچھ سکتے ہیں۔

[illegible] تھے لیکن اب [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

رنگین، شستہ، شائستہ اور شگفتہ ہوتی ہے۔ فیچر میں بھی ایک ندرت ضروری ہے۔ مضمون کی عمارت اگر شاندار ہوتی ہے تو فیچر ایک پاک صاف، خوبصورت اور آرام دہ چھوٹا سا مکان ہے۔ مگر جس طرح اچھی غزل کہنی آسان اور نظم کہنی مشکل ہے اسی طرح اچھا فیچر پڑھنا آسان اور لکھنا مشکل ہے۔ اس کے لیے وسعت مطالعہ، تخیل آفرینی، ندرت فکر، شستہ شگفتہ اور شیریں زبان تنقیدی صلاحیت اور وجدان کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کے بغیر اچھے صحافی اور اچھے مضمون نگار تو ہو سکتے ہیں، اچھے فیچر نگار نہیں۔

باب دوم:

اردو کے چند نامور صحافی

مولانا محمد عثمان فارقلیط کی صحافت

آزاد ہندوستان کی ابتدائی چند دہائیوں میں اردو کے جو ممتاز صحافی گزرے ہیں ان میں ایک اہم نام مولانا محمد عثمان فارقلیط کا بھی ہے۔ وہ کم و بیش ایک چوتھائی صدی تک جمعیۃ علمائے ہند کے روزنامہ اخبار ''الجمعیۃ'' سے وابستہ رہے اور اپنے اداریوں اور شذرات سے پامال ملت اور مایوس قوم کو، جو تقسیم ہند کے بعد ایک ہاری ہوئی فوج میں تبدیل ہو چکی تھی، ایک جرأت مند اور باحوصلہ فوج میں بدلنے کا گراں قدر فریضہ انجام دیتے رہے۔ آزادی کے بعد پست حوصلہ مسلمانوں میں زندگی کا نیا جوش اور ولولہ پیدا کرنے اور فسادات کے زخموں سے چور شکست خوردہ ملت اسلامیۂ ہند کو پھر سے کھڑا کرنے میں انھوں نے جو ناقابل فراموش کردار ادا کیا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

مولانا محمد عثمان فارقلیط کی پیدائش یوں تو دہلی میں ہوئی تھی اور ان کی تقریباً پوری زندگی دہلی ہی میں گزری لیکن ان کا آبائی وطن اتر پردیش کا مردم خیز قصبہ پلکھوہ تھا۔ ان کے والد حاجی محمد احمد کا تعلق وہیں سے تھا۔ یہ قصبہ پہلے میرٹھ ضلع میں آتا تھا اب غازی آباد ضلع میں ہے۔ دہلی کے چاندنی چوک سے ملحق کوچہ [illegible] میں جس کا نام آزادی سے پہلے کوچہ تیجا بنداں تھا، پیدا ہوئے تھے۔ اس کوچہ میں ایک مسلم خاندان تھا جو دراصل مولانا کا خاندان تھا۔ مولانا کے والد صنعت کار تھے اور چھوٹے موٹے ٹھیکے لیا کرتے تھے۔ لیکن وہ اپنے بیٹے کو ٹھیکیدار بنانا نہیں چاہتے تھے اسی لیے وہ ان کو ہمیشہ لکھنے پڑھنے کی تلقین اور نصیحت کیا کرتے تھے۔ مولانا فارقلیط کا ذوق بھی ٹھیکیداری سے میل نہیں کھاتا تھا۔ ان کو دنیا میں بڑا کام کرنا تھا اور آزادی کے بعد پژمردہ مسلم قوم میں نیا جوش و ولولہ پیدا کر کے اسے اپنے پیروں پر کھڑا کرنا تھا۔ انھوں نے اپنے والد کی

... بچپن سے ہی دین کا ... پڑھنا شروع کر دیا۔ ان کی تعلیم گھر پر ہی شروع ہوئی۔
... اسلامی تعلیم پر صرف تھا۔

... ایک بلند پایہ صوفی تو تھے ہی، ایک بہترین انسان بھی تھے۔ ... زیادہ ... تھے اور ... ایک سچے اور مخلص خادم بھی تھے۔ وہ انتہائی ... ہونے کے باوجود نمود و نمائش سے دور تھے اور ایک کونے میں بیٹھ کر اپنے کام میں مشغول رہتے تھے۔ وہ انتہائی غیر متعصب قسم کے انسان تھے اور سچے ... رکھتے تھے۔ لیکن جواب اتنے مدلل انداز میں دیتے تھے ... جواب ہو جاتا۔ ان کی اپنی یادداشتوں کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے ... باقاعدہ ... کسی مدرسے سے ... فراغت نہیں ہوئی تھی۔ ہاں مختلف مدارس میں متعدد ... سے ... تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے مختلف موضوعات کا گہرا مطالعہ کیا ... تھا ... مضمون ... بحث میں ان کو شکست دینا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے بچپن میں ... اور قادیانیوں کے ... مناظرے دیکھے تھے۔ وہ خود بھی ایک ... اس سلسلے میں ... کا مطالعہ ... یہاں تک کہ ایک بار نوجوانی کی ... میں انہوں نے قادیانیوں ... تو انہیں شکست فاش سے دوچار کر دیا۔

صحافت کا آغاز

... نے نصف صدی تک صحافت سے وابستہ رہ کر جس طرح پرورش لوح و قلم کی ... بہت کم ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے قلم کو ہمیشہ ایک مقدس امانت سمجھا اور کبھی بھی اس امانت میں خیانت نہیں کی۔ ان کا قلم ایک مقدس اور پاکیزہ ہتھیار تھا جس سے وہ مسلمانان سندھ ... کا دفاع کرتے تھے اور ان ... کا بیڑا اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کی صحافت کا آغاز ... سن 1920 میں کراچی کے سندھی اخبار الوحید سے ہوا۔ اگرچہ وہ اخبار کے ... تھے ... عربی اخبار کے مضامین کا اردو میں ترجمہ کرتا تھا ... سندھی میں

ترجمہ کرتے اور وہ اخبار میں شائع کیا جاتا۔ لیکن رفتہ رفتہ پنڈت جی کی توجہ ان کی دوسری طرف منتقل ہونے لگی۔ یعنی ملکانوں کو مرتد ہونے سے بچانا۔ اس وقت شدھی سنگٹھن سے وابستہ ہندو لیڈر تھے اور وہ مسلمانوں کو شدھی کرنے میں مصروف تھے، جس کے نتیجے میں سیدھے سادے ملکانے بھی مرتد ہونے لگے تھے۔ ان کو مرتد ہونے سے بچانے کے لیے مولانا قاسمی نے اپنی خدمات پیش کر دی تھیں۔ انہیں کارکنوں کی ضرورت تھی اور وہ اپنے علمی تعاون سے ان کو مرتد ہونے سے روکتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے وہاں بہت سے مناظرے بھی کیے اور انھیں مرتد ہونے سے واپس لے آئے۔

مولانا 1928 کے اوائل میں دہلی واپس آ گئے اور اخبار "الجمعیۃ" سے وابستہ ہو گئے لیکن 1930 میں جب کہ جمعیۃ علمائے ہند اور کانگریس سے جنگ کی تیاریوں کے سلسلے میں کچھ کراچی چلے گئے۔ وہ 1928 سے 1930 تک کراچی میں رہے۔ اسی درمیان جب وہ اخبار الجمعیۃ سے وابستہ ہوئے تو اس وقت اس کے ایڈیٹر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی تھے۔ مولانا قاسمی کو ان کا معاون مدیر بنایا گیا۔ ان کا کام سہ روزہ کے لیے نوٹ لکھنا اور خبریں مرتب کرنا تھا۔ مولانا مودودی ان کی تحریروں کو پڑھتے تھے اور بقول مولانا قاسمی "مولانا مودودی نے کئی بار کہا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے لکھنے کی اچھی مشق کی ہے۔ اسی طرح لکھتے رہو ایک روز تمہارے قلم کی شہرت ہوگی اور تمہاری تحریروں کو پسند کیا جائے گا اور مشق کرتے رہو تو رنگ اور نکھر جائے گا۔ میں نے ان سے ایک بار عرض کیا کہ میں 1918 سے مولانا ابوالوفا ثناء اللہ امرتسری کے اخبار اہل حدیث میں آریوں اور عیسائیوں کے جوابات برابر لکھتا رہا ہوں اس لیے میری مشق خاصی پرانی ہے۔" مولانا مودودی کے الجمعیۃ سے چلے جانے کے بعد انھیں چیف ایڈیٹر بنا دیا گیا لیکن صحت کی خرابی کے سبب انھیں اس سے الگ ہونا پڑا۔ پھر بھی وہ زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی کے کہنے پر پھر الجمعیۃ سے وابستہ ہو گئے لیکن کچھ دنوں کے بعد اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد وہ اپنے وطن چھتوہ (اتر پردیش) چلے گئے۔ 1939 میں لاہور کے اخبار زمزم کی ادارت سنبھالنے کی پیشکش کی اور وہ لاہور چلے گئے۔ آزادی کے بعد جب اخبار الجمعیۃ دوبارہ شروع ہوا تو بقول سیمان صابر ان کی تجدید ثانی پر مولانا

[illegible] فارقلیط و جمعیت کے لیے [illegible] مارچ 1947 سے لے کر 1973
تک [illegible] سے وابستہ رہے۔ اس سلسلے میں سلیمان صابر لکھتے ہیں "مولانا نے 1947 کے
[illegible] میں [illegible] ایسے وقت الجمعیۃ کی ادارت سنبھالی جب شاہجہاں کی بسائی دلی کی تہذیب
[illegible] پرانی قدریں ہچکیاں لیتی نظر آرہی تھیں۔ قومی یک جہتی کا دعویٰ کرنے والے بڑے بڑے ممتاز
رہنما [illegible] تھے اور پوری ملت اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہی تھی۔ مولانا کو اپنا
[illegible] (پاکستان) جا سکتے تھے۔ تقریباً نو سال کی غیر حاضری کے بعد الجمعیۃ اس
[illegible] روزنامہ کی شکل میں مستقل طور پر آیا۔ مولانا نے اپنے پہلے ہی اداریہ میں
[illegible] خوف و دہشت کے ماحول کو بدلنے میں اپنا رول ادا کریں گے۔ انھوں نے تقسیم
کے [illegible] پیدا ہونے والے خوف [illegible] کی کیفیت کا سب سے بڑا باعث قرار
[illegible] مسلمانوں کے ذہن و مزاج کو درست
[illegible] کو بلند کرنے کی تدابیر عمل میں لائے۔"

تعمیری صحافت کا نمونہ

[illegible] مسلمانوں کے اندر نہ صرف یہ
[illegible] انھوں نے 18 جنوری 1948 کے
شمارے میں [illegible] مسلمانوں کا [illegible] نہیں ہے
[illegible] کی رٹ لگا رکھی ہیں۔ اب ان کا
[illegible] آخر تمہیں تھامنے
[illegible] تو تم بھی اپنے قدموں پر کھڑے
[illegible] کوئی کب تک انھیں سنبھالے گا اور
[illegible] کا ہاتھ پکڑتا رہے گا۔ [illegible] استقامت سے کام
[illegible] مشکلات سے [illegible]
[illegible]

[illegible] 28 دسمبر 1969 [illegible] میں مسلمانوں کی [illegible]

[illegible] مستقبل [illegible]

[illegible] مسلمان [illegible] جیسے [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] بھی انھوں نے مسلمانوں کو بیدار کرنے کی اپنی کوشش

[illegible] ان کا قلم چلتا رہا اور رواں دواں رہا۔ نہ مولانا

[illegible] پژمردگی نے قبضہ کیا۔ اسی کی طرح ان کا قلم

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کا مشغلہ اختیار نہیں کیا۔ [illegible] کا بھی ایک تحفہ [illegible] قدرت [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] آواز اٹھائی اور اس کے

[illegible]

[illegible]

مولانا فارقلیط بہت حاضر جواب تھے اور اپنے جملوں سے محفلوں کو دلچسپ [illegible]

تھے۔ لیکن ان دو [illegible] الجمعیۃ سے [illegible] ہندوستان کی تقسیم پرتاپ اخبار سے برابر چلتی رہی۔ پرتاپ سے ایسے مباحث [illegible] لیکن جو مسلمانوں [illegible] چھپ جاتی تھیں ان تحریروں کا نشانہ بنتے [illegible] کے مضمون کی تائید نہیں [illegible] لیکن اپنی فطرت سے مطابق [illegible] نہیں بیٹھتے تھے۔ اخبار میں جتنے بھی بیانات [illegible] الجمعیۃ کا مطالعہ کرتا تھا [illegible] پرتاپ وغیرہ پڑھتا تھا۔ مولانا [illegible] پرتاپ کے مضمون کا جواب لکھتے [illegible] الجمعیۃ میں آ جاتا۔ قارئین دونوں باتوں کا تقابل کرتے [illegible] مباحث یا باتیں [illegible] قلم [illegible] کا یہ جواب [illegible] اس وقت [illegible] دونوں کا [illegible] مباحث اور [illegible] مضمون کی وجہ سے قارئین میں یہ [illegible] دلچسپی [illegible] ہوتے تھے [illegible] روشن خیالی بڑھتی تھی۔ پروفیسر [illegible] احمد فاروقی نے ایک [illegible] کے متعلق [illegible] پرتاپ سے [illegible] جس کی [illegible] ہی اللہ نے [illegible] میں [illegible] تھی [illegible] وطن دوست نہیں ہو سکتا، وہ مذہب کو وطن سے [illegible] فرقہ [illegible] کا جواب [illegible] اور یہ بات [illegible] مباحث [illegible] مذہب پر [illegible] ہندوستان سے [illegible] رہتا تھا۔ اس کا مباحث [illegible] گئے۔

[illegible] بہت سے واقعات ہیں جن میں مولانا کی [illegible] نے [illegible] لیکن [illegible] صرف اتنا ہی نہیں [illegible] تحریریں بڑی دلچسپی اور محبت سے [illegible] تھے [illegible] بھی ظاہر کرتے تھے اور خطوط [illegible] تحریروں سے [illegible] کی کمی نہیں تھی۔ یہاں تک کہ [illegible] سے عقیدت کی بنیاد پر اپنے نام کے [illegible] فرقہ [illegible] لازم و ملزوم بن گئے تھے [illegible] مسلمانوں [illegible] کا [illegible] ان کا [illegible] اور [illegible] الجمعیۃ [illegible] فرقہ [illegible] تھی۔ یہ اخبار تقریباً پورے ملک میں یا کم از کم [illegible] تھا۔ [illegible] ایسا اخبار اس وقت موجود نہیں تھا جو [illegible] مسلمانوں کے بارے میں [illegible] جیسے [illegible] میں الجمعیۃ رکھتا

[illegible] انھوں نے [illegible] آزاد ہندوستان کی حکومت کو بھی نہیں بخشا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کے
مسائل پر [illegible] اخبار جمعیۃ علماء کا تھا اور
[illegible]
[illegible] نہیں تھے [illegible]
[illegible]
[illegible] خدمات [illegible] خراج عقیدت پیش
[illegible] آزادی کے بعد [illegible] مسلمانوں [illegible]
[illegible]

قومی یک جہتی کے علمبردار

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] یا اختلاف کو ہوا نہیں دی۔ وہ صدق دل سے چاہتے تھے کہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] فسادات [illegible]

[illegible]

[illegible]

بھی زور دیا ہے کہ فسادات دراصل انسانیت کی پیشانی پر بدنما داغ ہیں۔ کیونکہ [illegible] بے قصور

[illegible] انسانیت [illegible] انھوں نے اپنے متعدد اداریوں میں ہندو مسلم

[illegible] اور [illegible] کر لکھا ہے کہ ان دونوں فرقوں کی دوستی اور اتحاد وقت کی سب

سے بڑی ضرورت ہے۔

[illegible]

[illegible] نہیں میل جول سے حل ہوگا۔ انھیں سوچنا چاہیے کہ ان کے حق میں کیا چیز بہتر ہے اور

[illegible] 1951 [illegible]

[illegible] اپنے قدموں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] کہ سیکولرزم ہی اس ملک میں انصاف

[illegible] ہندو ملک بنا ہوتا یا کوئی اور نظام رائج

[illegible]

مولانا مودودی 23 اگست 1965 کے اداریے میں لکھتے ہیں "موجودہ وقت ہندوستان

[illegible] ضروری ہے مگر اس کا مقابلہ [illegible] چاہیے [illegible]

[illegible] حکومت کے ہاتھوں سے اپنے [illegible]

[illegible] بالکل ترک کر دینا [illegible] والی باتیں [illegible]

کارنامہ نہیں ہے کہ [illegible]

ضروری ہے اور حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنا بھی [illegible]

[illegible]

[illegible] اجازت نہ دی جائے کہ وہ ملک کا حال خراب [illegible]

[illegible] فروری [illegible]

[illegible] ضرورت ہے۔ اس سے بغیر ہماری گاڑی [illegible] نہیں چل سکتی۔ مگر [illegible]

[illegible]

[illegible] سے جنگلوں کو [illegible] مختلف [illegible] رہتے ہیں ان کے مذہب [illegible] تہذیب [illegible] اور مختلف [illegible] مذہب [illegible] تہذیب اور ان کے نظریات اور افکار کا احترام کرتے [illegible] خوشی سے برداشت [illegible] احترام کا جذبہ ان تمام طبقات میں [illegible]

[illegible] پرانی تہذیب [illegible]

[illegible]

انھیں طرح تشیع کا نشانہ بنتے رہیں گے تو ملک میں نہ تو امن قائم ہوگا اور نہ ہی یہ ملک ترقی کرے گا۔ مولانا نے اپنی تحریر میں کسی مذہب یا فرقے کا نام نہیں لیا ہے۔ انھوں نے جو باتیں کہی ہیں وہ اس ملک کے تمام فرقوں اور جماعتوں پر صادق آتی ہیں۔ ضرورت ہے کہ سبھی اس پر عمل کریں۔ ہاں اس ملک میں ایک خاص جماعت ایسی ہے جو مسلمانوں کو نشانہ بناتا ہے، ان کو حملہ آور قرار دیتا ہے اور انھیں غیر ملکی بتاتا ہے۔ وہ بے حد خطرناک ہے اور ایک ایسا نظریہ ہے جو فرقہ واریت اور خلاف امن ہے۔ لہٰذا تمام فرقوں کو باہم متحد ہو کر رہنا چاہیے، تاکہ اس مخصوص جماعت کو دوسرے کسی طبقے کو نشانہ بنانے کا موقع نہ دیا جانا چاہیے۔ اسی صورت میں اس ملک کی ترقی ہو سکتی ہے۔

آزادی کے بعد ملک میں سنسکرت زبان کی بے شمار تنظیمیں قائم ہوتی رہی ہیں۔ حکومت بھی اس زبان کو بچانے اور اس کی ترقی و اشاعت میں مسلسل مصروف رہی ہے۔ اسی سلسلے میں [illegible] میں دہلی میں عالمی سنسکرت کانفرنس منعقد کی گئی۔ ملک کے ایک معروف مذہبی رہنما [illegible] نے اس کانفرنس پر اعتراض کیا اور بتایا کہ قدیم زمانہ میں سنسکرت [illegible] کو صرف [illegible] ہی پڑھ سکتے تھے۔ [illegible] شودروں کو سنسکرت پڑھنے اور پڑھانے کی سخت ممانعت تھی اور خلاف ورزی پر انھیں سزا دی جاتی تھی۔ عورتوں کو سنسکرت میں بات چیت کرنے کی اجازت نہیں تھی اور [illegible] کے لیے اس زبان کا سیکھنا ممنوع قرار دیا گیا تھا۔ [illegible] میں اتحاد قائم کرنے کا مقصد پوشیدہ ہے۔ [illegible] میں "خدمت اور رواداری" [illegible] سنسکرت [illegible] کانفرنس منعقد [illegible] خدمت [illegible] خدمات [illegible]

منو شلوک میں منتقل کیا۔ آج بھی گیتا کے 34 ترجمے دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں محفوظ ہیں۔ ہم ہماری خاندان میں سنسکرت کے بڑے بڑے عالم ہوئے۔ سید علی بلگرامی تو سنسکرت زبان کے محقق قرار پائے۔ قاضی محمد بشیر احمد پنڈت کی سنسکرت دانی [illegible] میں ان کی تصنیفات سے [illegible]۔ غرض مسلمانوں نے کبھی سنسکرت زبان کے بارے میں تعصب سے کام نہیں لیا۔ بلکہ اس کی ایسی خدمت کی کہ نہ صرف سنسکرت کا سرمایہ دوسری زبانوں میں منتقل ہو گیا بلکہ بیرونی دنیا میں ہندوستان کو متعارف ہونے کا موقع ملا۔ [illegible] تک سنسکرت عالم ویدوں کا ترجمہ دوسری زبانوں میں پیش نہ کر سکے [illegible] سنسکرت کے کئی ہندو عالم نے قرآن کریم کو سنسکرت میں منتقل کیا [illegible] سنسکرت کا جامہ پہنایا۔ یہ خدمت بھی قابل قدر ہوتی [illegible] ہمیشہ محروم رہتے ہیں [illegible] اپنی زبان تک [illegible] کی طرف سے تو ان کی مذہبی [illegible] سنسکرت والوں [illegible] نہیں۔

[illegible] مختلف [illegible] ہیں [illegible] زبان وغیرہ [illegible] اس کے ادب کو اپنی زبان میں یا دنیا کی دوسری زبانوں میں منتقل کریں گے تو [illegible] اور [illegible] سے کام میں [illegible] زبانوں کے ذخیرے کو اپنی زبان میں یا دوسری زبانوں میں منتقل نہیں کریں گے تو اس [illegible] سنسکرت [illegible] میں منتقل [illegible] سنسکرت [illegible] ایک [illegible] اور [illegible] تعصب کا خاتمہ ہوتا اور مختلف زبانوں [illegible] صورت پیدا ہوتی [illegible] نے [illegible] کا مقصد [illegible] مختلف زبانوں [illegible]

کا نہ صرف اعتراف کرنا چاہیے بلکہ [illegible] اب کوئی زبان میں منتقل بھی کرنا چاہیے۔ یعنی یہ ایک نیک [illegible] قدر مشورہ ہے اور اگر اس پر عمل کیا جائے تو [illegible] میں [illegible] ایک ہی قوم [illegible] ہو گا اور جس سے دوسرے اختلافات بھی فرو ہو جائیں گے۔

اسی دور میں تنظیم کی ضرورت پر [illegible] ایک [illegible] سے قابل ذکر ہے جو 4/جون 1960 کو لکھا گیا ہے۔ مولانا نے یہ [illegible] پرکاش [illegible] کی اس تقریر کے جواب میں [illegible] جو انھوں نے [illegible] حیدر آباد کے جلسے میں کی تھی اور جس میں انھوں نے [illegible] ہندوستان میں [illegible] ہیں۔ انھوں نے یہ الزام بھی [illegible] ہندوستان کے مسلمان پاکستان [illegible] ہیں اور [illegible] میں [illegible] ہیں [illegible] وہ پاکستان کو خبریں مہیا کرتے ہیں۔ اس کے جواب میں [illegible] معلومات [illegible] نہیں [illegible] مسلمان [illegible] ایک [illegible] وہ اپنے [illegible] میں [illegible] کہتے ہیں [illegible] ہمیں ہندوستان کا اتحاد سب سے زیادہ عزیز ہے اور ہم اس جماعت کو سب سے زیادہ وطن دشمن سمجھتے ہیں جو [illegible] ہندوستان متحد نہیں [illegible] متحد نہیں [illegible] قدرت نے [illegible] قدرت [illegible] متحد ہو سکا۔ حال اور مستقبل میں بھی متحد ہونے کی امید نہیں ہے۔ [illegible] ہندوستان [illegible] متحد نہیں ہو سکتا [illegible] ہندوستان [illegible] اختلافات [illegible] ہندو، مسلمان، عیسائی [illegible] اتحاد [illegible] نفرت [illegible] اپنی جان تک [illegible] کا جذبہ رکھتا ہو [illegible]

فرقدیؔ ایسے ہی ایک محب وطن شہری تھے جو وطن پر آنے والی معمولی سی آنچ کو بھی برداشت [illegible] کو تیار نہیں تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملک کے شہری ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیار محبت سے رہیں [illegible] پیدا ہو کیونکہ اگر ان میں اتحاد پیدا نہیں ہوا تو [illegible] ہندوستان [illegible] باشندوں کا [illegible] تحریریں [illegible] محبت اور خلوص [illegible] نفرت عداوت [illegible] تحریک [illegible] میل جل کر رہنے کے لیے [illegible] ہیں۔ ایسی تحریریں [illegible] فرقدیؔ جیسے صحافی [illegible] جو اپنی پوری صحافتی زندگی میں اتحاد و یکجہتی [illegible] اپنے قلم سے [illegible] فرقدیؔ نے [illegible] تہذیب کو پروان چڑھانے کے لیے اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا [illegible] جو ملک میں فرقہ [illegible] چاہتے ہیں اور جو [illegible] ہیں۔

[illegible] کی تفصیل بہت طویل ہے۔ بعض خصوصیات کی طرف [illegible] آج کے دور میں اسی قسم کے صحافیوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے [illegible] طاقتوں کی [illegible] کے بارے میں [illegible]

[illegible]
[illegible]

[illegible] موت [illegible] موت [illegible] فرقدیؔ [illegible] سے تعلق رکھتے تھے۔ [illegible] سمندر میں غرق ہو گئے تھے اور پوری [illegible] تھی۔ [illegible] گیا تھا۔ [illegible] موت نہیں تھی بلکہ ان کے اپنے خاندان کے [illegible] موت [illegible]

دامن پر چھینٹے رہ گئے ہیں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چند دنوں کے بعد ہی ایک طرح سے انھیں فراموش کر دیا گیا۔ یوں تو اس جرم میں تمام لوگ شریک ہیں لیکن اصل مجرم مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ اور صحافی برادری ہے۔ اردو صحافیوں نے قدم صحافت کے اس عظیم ستون کی یاد میں نہ تو کوئی ادارہ قائم کیا اور نہ ہی ان کی یادوں کو زندہ رکھنے کے لیے کوئی ادارہ پیدا کیا۔ جبکہ مسلمانانِ ہند اور اردو صحافی آج بھی ان کے احسانوں کے بار تلے دبے ہوئے ہیں۔ لیکن بہرحال ایسے چند افراد موجود ہیں جو ان کی یادوں کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جو دنیا کو اس سے روشناس کرانے اور بھولا ہوا سبق یاد کرانے کا عزم بھی رکھتے ہیں۔ ہندوستان میں جب بھی صحافت کا ذکر ہوگا اور اس کی تاریخ لکھی جائے گی ہندوستانی فرقہ پرستی کا بھی ذکر ہوگا وہاں ان کی داستانِ عزیمت، جرأت اور ایثار و قربانی کے بغیر یہ تاریخ ادھوری رہے گی اور انھیں یاد کرکے لوگوں کی آنکھیں نم ہوتی رہیں گی۔

ع مدتوں رویا کریں گے جام و پیمانہ تجھے

محمد عتیق صدیقی کو خراج عقیدت

[illegible]

ایک کتاب "عتیق صدیقی حیات وخدمات" کا اجرا عمل میں آیا ہے۔

چار معرکۃ الآرا کتابیں

صحافت پر مرحوم عتیق صدیقی کی چار معرکۃ الآرا کتابیں ہیں جن کے نام "ہندوستانی اخبار نویسی کمپنی کے عہد میں"، "صوبہ شمال مغربی کے اخبارات ومطبوعات"، "1857 کے اخبار اور دستاویزیں" اور "ہندوستانی صحافت" ہیں۔ ان تصنیفات کا سنہ اشاعت علی الترتیب 1957، 1962، 1966 اور 2011 ہے۔ 1857 کے اخباروں اور دستاویزوں سے متعلق کتاب کو ترتیب دینے میں مرحوم نے بے حد جاں فشانی سے کام لیا تھا۔ اسے مکتبہ شاہراہ دہلی نے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں "ہندوستانی اخبار نویسی کی تاریخ کا یہ افسوسناک باب ہے کہ 1857 سے قبل اردو اخباروں کی مکمل فائلیں تو کیا ان کے اکا دکا پرچے بھی محفوظ نہیں ہیں اور اب تک کسی کو اس کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ ورنہ ان کی مدد سے 1857 کی بغاوت کی پوری تاریخ مرتب کی جا سکتی تھی۔ نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں دلی کے تین اخبارات صادق الاخبار، دہلی اردو اخبار اور سراج الاخبار کے 1857 کے شمارے منتشر حالت میں محفوظ ہیں۔ یہی وہ دستاویزیں ہیں جو ان کتابوں میں ہیں۔ پیش نظر مجموعہ نیشنل آرکائیوز کے ان ہی منتشر ذخیروں سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ مختلف حصوں میں چھپا ہوا ہے۔ اس کتاب میں "پس منظر" کے تحت 1857 کی جنگ سے قبل کے مختلف شہروں کے حالات اس زمانے کے اخبارات کی روشنی میں لکھے ہیں۔ اس کے بعد مذکورہ تینوں اخبارات کی خبروں کے تراشے ان کی اہمیت کے پیش نظر شامل کیے گئے ہیں اور آخر میں 1857 کی دستاویزات کا متن اور ان کی تفصیل ہے۔ 447 صفحات پر مشتمل یہ کتاب اس وقت کے حالات کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ اس سلسلے میں حال ہی میں انگریزی میں آئی ایک کتاب کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جو اس زمانے کے اردو فارسی اخبارات کی خبروں کے ترجمے اور تجزیے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا نام BESIEGED VOICES FROM DELHI 1857 ہے جسے پینگوئن نے شائع کیا ہے۔ 458 صفحات پر مشتمل اس کتاب کے مرتب و مترجم محمود فاروقی ہیں۔ انھوں نے خبروں کا تجزیہ کرتے وقت جزئیات پر بھی خصوصی توجہ دی ہے اور اس کتاب کی بڑی پذیرائی ہو رہی

ہے۔ انھوں نے محنت سے اس کتاب کی تیاری میں جنھوں نے شکستہ اردو کے مواد کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت سے اخبارات کی کیا اہمیت ہوتی اور عتیق صدیقی کی مذکورہ کتاب کی تحقیقی اہمیت ہوئی۔

عتیق صدیقی کی مذکورہ کتاب جس میں اخبارات کے حوالے سے تحقیق کا جائزہ لیا گیا ہے، ایک تحقیق ہے جس میں خبر نویسی اور ہندوستانی وغیرہ کے انگریزوں اور مطبوعات پر تحریر پیش کی ہے۔ ہندوستانی صحافت کی ابتدا پر ایک اہم کتاب ہے۔ اس میں ایک مضمون "تحقیق ہند میں اردو اخبار نویسی" ہے۔ اس کے علاوہ گورنر کے عہد میں اور شاہی عہد میں ہندوستانی صحافت کا بھی جائزہ لیا گیا ہے۔ "ہندوستانی صحافت کے ابتدائی دور" کے عنوان سے ایک بہت معلوماتی مضمون بھی اس میں شامل ہے۔ اس سے اردو صحافت کے ابتدائی اخبارات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔

عتیق صدیقی نے ایک مضمون میں ہندوستانی صحافت اردو صحافت کے چار سال بعد شروع ہونے کی بات لکھی ہیں "ہندوستان میں 1780 میں ہندوستان کے پہلے اخبار کا آغاز ہوا۔ بعد میں جو اخبار جاری ہوا وہ پہلا اخبار جو اپنے مالک اور ایڈیٹر مسٹر ہکی کے نام کی مناسبت سے ہکیز گزٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس کا دوسرا نام کلکتہ جنرل ایڈورٹائزر بھی تھا۔ انھوں نے مسٹر ہکی کو ہندوستانی اخبار نویسی کا باوا آدم کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "ہکیز گزٹ کے اجرا کے چار ماہ بعد نومبر 1780 میں ہندوستان کا دوسرا اخبار انڈیا گزٹ کے نام سے کلکتہ ہی سے نمودار ہوا۔ بعض تاریخی شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ مارچ 1822 میں (اردو جام جہاں نما) اور (فارسی مرآۃ الاخبار) کا چند روز کے تفاوت سے ایک ساتھ اجرا ہوا۔ ان دونوں کے اجرا کے چار سال بعد کلکتہ ہی سے ہندوستانی زبان ہندی کے پہلے اخبار کا بھی اجرا ہوا۔ اس کا نام "اودنت مارتنڈ" تھا۔ ایڈیٹر جگل کشور شکل تھے۔ اس کا پہلا شمارہ 31 مئی 1826 کو شائع ہوا۔"

غیر ممالک میں صحافت

عتیق صدیقی ایسے بلند پایہ صحافی تھے کہ انھوں نے صحافت پر تحقیقی کام کرنے کے علاوہ

صرف ہندوستان ہی میں مختلف اخبارات کی ادارت نہیں سنبھالی بلکہ بغداد اور قاہرہ میں بھی صحافت کے فرائض انجام دیے۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے عتیق صدیقی صرف صحافی ہی نہیں بلکہ ایک ادیب اور دانشور بھی تھے اور ان کی ادبی تصنیفات بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ 19[illegible] میں شائع ان کی کتاب گلدستہ اور اس کا عہد خاصی مشہور اور مقبول ہوئی، جس میں انھوں نے کئی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی کتاب "اقبال جادوگر ہندی نژاد" کو بھی کافی شہرت ملی۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ وہ غالبیات، اقبالیات، لسانیات، آزادیات، جوہریات وغیرہ کے بھی ماہر تھے۔ اس کے علاوہ انھیں تاریخ سے بھی گہرا شغف رہا ہے۔ وہ سیاسی طور پر بھی کافی بیدار ذہن رکھتے تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں بھی ان کی شمولیت تھی۔ ان کے سیاسی اور تاریخی مضامین اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کا قلم اور دماغ کسی ایک ہی سمت میں چلنے کو تیار نہیں تھے بلکہ وہ ہمہ فن مولا تھے اور جب اور جس موضوع پر لکھنے کی ضرورت ہوتی تھی ان کا قلم بے ساختہ اٹھ جاتا تھا۔ جہاں ان کی سیاسی سرگرمیوں کی فہرست بہت طویل ہے وہیں ان کی تصنیفات و تالیفات کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے۔ دراصل انھوں نے بہت زیادہ غیر ملکی اسفار بھی کیے تھے اس لیے ان کا ذہن بہت کشادہ تھا اور ان کی سوچ میں کافی گہرائی تھی۔ وہ کوئی بھی بات بغیر ثبوت کے نہیں کہتے تھے اور محنت و مشقت سے ان کی بڑی گہری شناسائی تھی۔

لیکن جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے کہ جن کا تعلق کالجوں، یونیورسٹیوں یا کسی بڑے اردو ادارے سے نہیں ہوتا ان پر لوگوں کی توجہ کم ہوتی ہے۔ ایسا ہی کچھ ان کے ساتھ بھی تھا۔ لیکن بہرحال ان کی موت کے بعد ہی سہی ان کا رشتہ یونیورسٹی سے قائم ہو گیا۔ ڈاکٹر اتین کنول نے ان کی تحریر کردہ کتابیں اور ان کے غیر مطبوعہ مضامین کو جو بکھرے ہوئے تھے لیکن ان پر کوئی مربوط کام ابھی تک نہیں ہوا تھا کتابی صورت میں شائع کروایا۔ یہ پہلا موقع ہے جب ان کی ذات اور خدمات پر ایم فل کی سطح کا کام کیا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے ان تمام لوگوں کو تلاش کیا جائے جن کی خدمات قابل ذکر ہیں لیکن جن کا ذکر نہیں ہوتا اور ان پر کام کیا جائے۔

محفوظ الرحمٰن کی صحافتی خدمات

محفوظ الرحمٰن صحافیوں کی جس نسل سے تعلق رکھتے تھے وہ اب رفتہ رفتہ ختم ہو رہی ہے۔ ان کو صحافتی قدریں عزیز ہی نہیں تھیں بلکہ وہ ان پر اپنی جان بھی چھڑکتے تھے۔ اس مزاج کے صحافی اپنے پیچھے ایک پوری نسل چھوڑ جاتے ہیں۔ مرحوم محفوظ الرحمٰن نے بھی ایک ایسی نسل چھوڑی ہے [illegible] ان کی روایات اور ان کی فکر [illegible] خراج عقیدت پیش کرتی رہتی ہیں۔

محفوظ الرحمٰن میں جو صحافتی خوبیاں تھیں [illegible] بہت کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں [illegible] دو پرست [illegible] قدریں [illegible] ذاتی تعلق [illegible] میں انھوں نے [illegible] قدروں [illegible] [illegible] تحریروں [illegible] وقت اپنے آپ کی تخفیف ہوتے تھے۔ [illegible] ان کی [illegible] فرض نہیں آتی تھی۔ [illegible] کا احترام کرتے تھے اور ان کے [illegible] ایک [illegible] کوشش بھی تھی۔ جس نے ایک بار

وہ قوت ارادی زندگی بھر کے لئے ان کا گرویدہ ہو گیا۔ یہاں کی شخصیت اور ان کے قلندری [illegible] تھی
کہ ان کے آستانے پر آپ بھی حاضری دیتے تھے اور غیر بھی، دوست احباب بھی، مریدین بھی۔ ان
کے ارادت مندوں میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن سے ان کا نظریاتی اختلاف رہا کرتا تھا۔ ان کے
حلقہ یاراں میں ہر مکتب فکر اور ہر طبقہ خیال کے لوگ موجود تھے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ سب ان سے
بڑی محبت کرتے تھے اور ان پر جان چھڑکنے کو تیار رہتے تھے۔ ان کے ارادت مندوں میں ہندو اور
انگریز صحافیوں کی بھی ایک بڑی تعداد تھی۔ وہ تعصب اور تنگ نظری کے سخت خلاف تھے اور قابل
ذکر بات یہ ہے کہ ایسے ہندوؤں کی بھی تعداد ان کی معتقد تھی جو ان کی دلچسپ اور قیمتی تشبیہ و [illegible]
[illegible] سے ساتھ گفتگو تھی جس سے لطف اندوز بھی ہوتی تھی۔

جس کے اندر خودداری کی حد تک [illegible] طور پر وقت پسندی ہوتا ہے اور یہ خوبیاں ان میں
بھی تھیں [illegible] قلندرانہ اوصاف بھی تھے۔ اسی لئے پچاس سال تک [illegible] عملی [illegible]
رہنے کے باوجود وہ اپنی [illegible] اور ۱۹۶۱ء [illegible] کی حصولیابی کی کوششوں سے کوسوں
دور تھے۔ [illegible] کی چھلانگ لگا لی لیکن وہ مادی
[illegible] بلند سے بلند تر ہوتا گیا اور وہ
[illegible]
[illegible]
[illegible] اور سیاسی میں اسٹریم میں ہمیشہ [illegible]
غیر ملکی سیاسی تجزیہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] قلندری [illegible]

[illegible]

وہ کسی ایسے فیصلے یا موقف کی حمایت نہیں کرتے تھے جس سے مسلم مخالفت یا اسلام دشمنی کی بو آتی ہو۔ دراصل ملی قدریں ان کی صحافت کی اساس تھیں۔ وہ یوں تو ایک مکمل صحافی تھے اور قومی و سیاسی امور پر ان کی زبردست گرفت تھی۔ ملک و بیرون ملک کا کوئی بھی مسئلہ ان کی دوراندیش نگاہوں اور ان کی تجزیاتی لیاقت سے پرے نہیں تھا۔ وہ ملکی و عالمی حالات و واقعات کا انتہائی گہرائی اور جزرسی کے ساتھ مشاہدہ اور مطالعہ کرتے تھے۔ لیکن ان کا قلم اس وقت بہت کاٹ دار اور دھاردار ہو جاتا تھا جب وہ کسی ملی مسئلے پر نظر ڈالتے تھے یا کسی ملی مسئلے کا پوسٹ مارٹم کرتے تھے۔ وہ ایسے مواقع پر کسی بھی مذہبی شخصیت سے خواہ اس کا عوامی قد کتنا ہی بلند و بالا کیوں نہ ہو اور اس کو ملی حلقوں میں کیسی ہی مقبولیت کیوں نہ حاصل ہو مرعوب نہیں ہوتے تھے اور اگر کسی بھی مذہبی شخصیت سے کوئی چوک ہوئی ہے تو ان کا قلم اسے بخشنے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ وہ ایسے مواقع پر کوئی بھی سمجھوتہ نہیں کرتے تھے اور ان کے قلم کے وار سے کوئی بھی نہیں بچتا تھا۔ وہ جب کسی اخبار یا رسالے کے مدیر رہے تب بھی اور نہیں رہے تب بھی اپنے اصولوں کی ڈگر پر ثابت قدمی کے ساتھ چلتے رہے۔ چونکہ کسی سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہیں تھا اس لیے ان کے قلم کا ترازو کسی بھی جانب جھکتا نہیں تھا۔ وہ اپنے قلمی ترازو کے ایک پلڑے پر ملت کو رکھتے تھے اور دوسرے پر ملی شخصیت کو۔ اور پھر ملی مفاد کی روشنی میں اپنا فیصلہ دیتے تھے۔

[illegible] مسلم مطلقہ خواتین بل کے جس انداز اور جس شکل میں وہ پاس ہوا ہے، سخت مخالف تھے۔ وہ پہلے دن سے ہی یہ کہتے رہے ہیں کہ یہ بل اسلام اور مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ہے اور عدالتیں طلاق اور نان و نفقہ کے مقدمات میں اس قانون کے تحت فیصلہ سنائیں گی اور وہ تمام فیصلے عائلی قوانین کے خلاف جائیں گے۔ یہ بات بعد میں سچ ثابت ہوئی اور ملک کی زیریں عدالتوں سے لے کر عدالت عظمیٰ تک متعدد مقدمات میں جو فیصلے سنائے گئے ہیں اور سنائے جا رہے ہیں وہ شریعت کے عائلی قوانین کے خلاف ہیں۔ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ اس سلسلے میں جو دوسرے مقدمات عدالتوں میں زیر سماعت ہیں ان میں بھی ایسے ہی فیصلے سنائے جائیں گے۔ وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ذمہ داروں کو بھی آڑے ہاتھوں لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ دراصل اس سے چند روز قبل لکھنؤ میں منعقدہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس میں منظور شدہ

قراردادوں اور فیصلوں پر انھوں نے سخت تنقید کی تھی اور اس بارے میں ان کا مضمون روزنامہ راشٹریہ سہارا میں شائع ہوا تھا۔ پرسنل لا بورڈ کے فیصلوں سے متعلق ان کا وہ آخری مضمون تھا۔ وہ ناعاقبت اندیش، خودغرض اور مصلحت کوش مسلم لیڈروں اور سیاست دانوں کے ان فیصلوں کی بھی سخت مخالفت کرتے تھے جو مسلمانوں کی ذلت و رسوائی کا سبب بننے کے امکانات رکھتے ہوں۔

محفوظ الرحمن کی علمیت، ان کی صحافیانہ صلاحیت اور ان کی قابلیت کی کیا مثال ہے کہ مجھ جیسی صحافت کے بے شمار طالب علم کسی اہم موضوع پر لکھنے سے قبل ان سے ضرور مشورہ کرتے تھے اور پھر ان کی گفتگو کی بنیاد پر یا بات چیت کے دوران ان کی زبان سے ادا ہوجانے والے چند جملوں کی بنیاد پر مضمون کی پوری عمارت کھڑی ہو جاتی تھی۔ ہندی یا انگریزی کے صحافیوں کو مسلم معاملات پر کوئی اسٹوری کرنی ہوتو وہ انھی کے آستانے پر حاضری دیتے تھے اور ان کے چند جملے ایکسکلیوسیو اسٹوری کی بنیاد بن جایا کرتے تھے۔ وہ خود بھی انویسٹی گیٹو اسٹوری کرنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتے تھے اور اپنی صحافتی زندگی میں انھوں نے اس کی بے شمار مثالیں بھی پیش کی تھیں۔ وہ واقعہ تو کوئی فراموش ہی نہیں کرسکتا جب انھوں نے میرٹھ اور ملیانہ کے متاثرین کے سلسلے میں جمع کی گئی رقم سے فساد زدہ رپورٹ اور سود کی رقم سے دفتر چلانے کے معاملے کا انکشاف کیا تھا اور "پندرہ روزہ" کا "[illegible]" شائع کرکے ملی و صحافتی حلقوں میں زلزلہ پیدا کردیا تھا۔ وہ صحافت کے اعلیٰ اصولوں کی پاسداری کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کے معیار کو بھی ذہن میں رکھتے تھے اور ایسی شستہ زبان لکھتے تھے کہ پڑھنے والے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ وہ بات چیت کے دوران آج کے اخباروں میں زبان کے گرتے معیار پر اظہار افسوس کرتے تھے اور کہتے تھے کہ موجودہ صحافیوں و مدیروں کی زبان کی ٹریننگ کا بھی انتظام کیا جانا چاہیے۔ ان کے اندر معاملات کو سمجھنے کی صلاحیت بدرجہ اتم موجود تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے تجزیاتی مضامین میں کوئی جھول نہیں ہوتا تھا، کوئی کمی نہیں ہوتی تھی۔

خردنوازی

وہ نوجوان صحافیوں کی بے حد حوصلہ افزائی کرتے تھے اور ان کی خامیوں کو نظرانداز کرتے

تے اور تقریروں میں ایسی بات کہہ جاتے تھے۔ بعد میں خود بخود یہ احساس ہو جاتا تھا کہ ہم سے غلطی ہو گئی ہے۔ لیکن وہ [illegible] ان کی شکایت نہیں کرتے تھے کہ کہیں اس سے اس کی عزت نفس کو ٹھیس نہ پہنچ جائے۔ جیسا کہ میں نے ذکر کیا ان کی قومی سرپرستی میں اردو صحافیوں کی پوری ایک نسل [illegible] ان کی سرپرستی میں بہت کچھ سیکھا۔ اردو صحافت کے معیار کو [illegible] کے ساتھ ساتھ دیانت داری اور خودداری کی اہمیت کو سمجھا۔ صحافت کے پیشے میں جب [illegible] آیا تب بھی محفوظ الرحمن اس [illegible] سے واقف ہی نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ [illegible] ایک [illegible]۔ انہوں نے اس [illegible] شہرت کو نہیں [illegible] جیسا کہ آج کل [illegible] بن چکی ہے۔ ان کے [illegible] میں بھی [illegible] تبدیلی نہیں آئی۔ ان سے ملنے جلنے والے کسی کو [illegible] کیسے ہیں۔ ابتر حالات میں بھی ان کے [illegible] نہیں ہوتی تھی۔

محفوظ الرحمن کی صحافتی خدمات طویل تھیں۔ انہوں نے زمانہ [illegible] ہی دوران و [illegible] میں بھی صحافت کی تھی اور [illegible] صحافت [illegible] یونیورسٹی سے [illegible] وابستہ ہوئے تھے۔ جب ڈاکٹر [illegible] مسلمانوں کے ساتھ [illegible] ہندوستانی مسلمانوں کو عزت و وقار کے ساتھ [illegible] مسلم مجلس مشاورت کی بنیاد ڈالی تو ان کے ایک معاون کی حیثیت سے محفوظ الرحمن ان کے ساتھ تھے۔ پھر انہوں نے جب لکھنؤ سے [illegible] انتخاب انہی پر جا کر رکی اور انہوں نے ان کو اس کا ایڈیٹر بنایا۔ وہ [illegible] سے بھی ایک عرصے تک ایڈیٹر رہے۔ پہلے سب ایڈیٹر کی حیثیت سے [illegible] تک کام کیا اس کے بعد ایڈیٹر کی ذمہ داریاں انجام دیں۔ ان کا مزاج اس قسم کا تھا کہ [illegible] عہدہ و منصب سے مرعوب ہونا نہیں جانتے تھے۔ میں نے ان سے طویل ذاتی تعلق کے دوران میں یہ اندازہ لگایا کہ وہ صرف [illegible] شخصیت سے متاثر تھے بلکہ ان کی شخصیت

سے عقیدت مند تھے۔ ایک ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور دوسرے مولانا محمد مسلم۔ باقی کی وجہ بھی وہ زندگی میں نہیں کرتے تھے۔ وہ جب بھی ان دونوں کے بارے میں گفتگو کرتے تو بہت جذباتی ہو جاتے اور خصوصاً ان کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے۔ وہ صحافیوں میں مولانا محمد عثمان فارقلیط کے بڑے قدردان تھے اور ان کے بارے میں بھی جب گفتگو کرتے تو جذباتی ہو جاتے۔ ان کے [illegible] مسلم [illegible] نگارشات [illegible] فارقلیط سے [illegible] ایک [illegible] شائع کیا تھا۔

شارہ

میں نے انہیں دنوں میں سہ روزہ [illegible] ملازمت کی شروعات کی تھی۔ ان کی [illegible] سے وہ [illegible] تھے [illegible] کیونکہ [illegible] سے [illegible] تک سہ روزہ [illegible] اور [illegible] سینٹر میں ملازمت پر مجھے بہت افسوس تھا جس کا جواب میں نے یہ دیا۔ میں نے پوچھا وہ کس طرح تو انہوں نے کہا کہ افغانستان پر روسی حملے کے خلاف ایک کتاب لکھو۔ (اس کتاب کا نام "سرخ یلغار" ہے اور اس میں نہ صرف روسی حملے کی خراش تفصیلات ہیں بلکہ افغانستان کی تاریخ بھی بیان کی گئی ہے۔) مکتوبہ زمن نے ایک انتہائی مقبول ہفت روزہ اخبار جمعیت کی ادارت سے فراغت پائی تھی اور "ہفت روزہ [illegible]" کے نام سے ایک ہفت روزہ "[illegible]" کے نام سے ایک اخبار بھی نکالا تھا۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں نے "ہفت روزہ" میں اسسٹنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا تھا۔ انہوں نے ذوالفقار علی بھٹو اور سعودی عرب پر بھی کتاب لکھی تھی اور کویت پر عراق کے حملے کے خلاف بھی ایک کتاب تصنیف کی تھی۔ [illegible] سطح پر جنرل ضیاء الحق سمیت متعدد سیاستدانوں سے تعلقات تھے جبکہ ہندوستانی سیاستدانوں سے انٹرویو کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ سابق نائب وزیر اعظم چودھری دیوی لال اور سابق وزیر اعظم وی پی سنگھ تو ان کے ذاتی دوست تھے لیکن انہوں نے ان سے کوئی مادی فائدہ نہیں اٹھایا۔

وہ اس ناچیز کی بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ان کی تحریک پر ہی میں نے میڈیا کا مطالعہ

شروع کیا اور ان کی رہنمائی میں میڈیا کے موضوع پر تین کتابیں تصنیف کیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کی ترغیب اور تحریک نے میرے اندر میڈیا کے بارے میں مطالعہ کا جذبہ پیدا کیا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ تم کوشش کرو کہ اس دنیا میں ایک کتاب ضرور شائع ہو جائے مرنے کے بعد بھی کتابیں زندہ رہتی ہیں۔ جب میری کتاب "میڈیا، روایات اور جدید رجحانات" شائع ہونے جا رہی تھی تو میں نے ان سے کہا کہ آپ اس کتاب پر مقدمہ لکھ دیں یا میں اس کا انتساب آپ کے نام کر دوں گا۔ مقدمہ لکھنے سے انکار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ اب مجھ سے نہیں لکھا جاتا۔ ہفت روزہ کی صحبت [illegible] سے لکھتا ہوں۔ بہرحال میں نے ان کے نام کتاب منسوب کردی اور جب ان کو بتایا تو کہنے لگے کہ میرے نام منسوب کرنے کے بجائے اپنے بزرگوں کے نام کیوں نہیں کرتے۔ میری زبان سے نکل گیا کہ میں اپنے بزرگ ہی کے نام کر رہا ہوں۔ ایک لمحے کو خاموش رہے پھر جذباتی ہو گئے اور [illegible] میں نے [illegible]۔ جب میں 2006 میں حج کرنے گیا تو [illegible] قومی آواز میں بالاقساط شائع ہوا تھا [illegible] اس سے قبل کہ یہ مجھے [illegible] ان کے [illegible] پورا [illegible] سے اچھا [illegible] کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوا۔ اس طرح میرے اوپر ان کی بڑی نوازشیں [illegible] ہیں۔

بہر حال محفوظ الرحمن جیسے لوگ کبھی کبھار ہی پیدا ہوتے ہیں اور آنے والی نسلوں کے لیے [illegible] جاتے ہیں۔ امید ہے کہ [illegible] پروان چڑھنے [illegible] [illegible] محفوظ الرحمن کی شخصیت پیش کرنے [illegible] کی توفیق [illegible] نہیں ہے۔

صحافت کا چراغ موہن چراغی

روزنامہ قومی آواز کے ہمارے سینئر ساتھی اور دوست سید اجمل حسین نے جب دو فروری 2010 کو یہ بری خبر سنائی کہ قومی آواز کے آخری مدیر موہن چراغی کا انتقال ہو گیا تو ایک جھٹکا سا لگا۔ دراصل ان کی گرتی ہوئی صحت اور پچھلے تین برسوں سے جاری علالت کے پیش نظر یہ اندیشہ تو تھا کہ اب ان کی عمر کے دن زیادہ نہیں بچے ہیں۔ لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اتنی جلدی چلے جائیں گے۔ انتقال سے تقریباً پندرہ روز قبل ان کا فون آیا۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ وہ ملنا چاہتے ہیں [illegible] اپنے مرض کے بارے میں تفصیل سے بتانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے مجھے ایک نام [illegible] اور کہا کہ وہ [illegible] کے بارے میں [illegible] سے [illegible] تیزی پکڑتی جا رہی تھی کہ انھیں خود پتہ نہیں ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے [illegible] نے واپسی پر ملاقات کی بات ہوئی [illegible] کے اصرار کی کوشش کی۔

قومی آواز بند ہونے کے بعد وہ بالکل تنہا ہو گئے تھے۔ جنوبی دہلی کے [illegible] میں اپنی بڑی بیٹی کے فلیٹ میں رہتے تھے جہاں ہم چند دوستوں کے علاوہ شاید ہی کوئی ملنے جاتا۔ انھیں تھا۔ وہ چونکہ بہت کم گو تھے اس لیے [illegible] میں دوست احباب بھی نہیں بنا سکے تھے۔ قومی آواز کے دنوں میں ان کا زیادہ تر وقت دفتر ہی میں گزرتا تھا اور صبح دس بجے آنا اور شام کو دیر سے جانا ان کا معمول تھا۔ اس پر ہم لوگ کہتے تھے کہ قومی آواز ان کی زندگی ہے اور ان کی سانس ہے۔ جس دن یہ سانس ٹوٹی وہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ تاہم وہ بہت سخت جان نکلے اور قومی آواز کے مرحوم ہو جانے کے بعد بھی تقریباً دو سال تک زندہ رہے۔ [illegible] میں ان سے جا کر ان سے مستقل ملنے والوں میں ہم چند لوگ ہی تھے اور ان کا [illegible] اخبار بند ہونے کے بعد

[illegible] تھے۔ [illegible] کے بعد
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

ایک بے بنیاد الزام

[illegible]
[illegible]
[illegible] حقیقت
[illegible]
[illegible] کہ ان پر کسی کا کوئی کنٹرول ہی نہیں رہا۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible] میں قومی
[illegible]
[illegible] سفید ہاتھی کہا جاتا تھا۔ بعد میں قومی آواز بھی
[illegible] تھے اور کوئی
[illegible]
[illegible] چراغ
[illegible] ناواقفیت

کی ایک بھی تھی۔ ان کے تقرر سے پہلے ہڑتال ہو چکی تھی۔ ایک دفعہ ان دونوں نے جو حکومت سے منسوب ہو رہی تھی رہے تھے تو ہم نے ان کی وقت سے بات کی تو میں نے مشورہ دیا کہ موہن چراغی صاحب سے ملیں۔ انہوں نے ملاقات کا وقت دیا تو میں نے انہوں نے تو قومی آواز کو بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ملازمین کی بات کہی۔ آپ ان سے ملیں اور فی الحال اس میں نہ پڑیں کہ قومی آواز کو بند کیا جائے۔ صاحب مل آئے تو ان کی رائے بدل چکی تھی اور دو گھنٹے کی ملاقات میں ان کو اتنا کچھ حاصل ہو گیا کہ ان کا فیصلہ بدل گیا۔ کہتے ہیں جب کوئی حادثہ ہو۔ چراغی صاحب نے قومی آواز کو بند ہونے سے بچایا۔ حکومت کی طرف تیں ہو ان پابندی کرتے ہیں۔ ان میں ان کی حد تک قصور وار سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی پوری ملازمت کے دوران کسی ایک بھی کارکن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی جبکہ وہ کر سکتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں اتنی طاقت تھی کہ ان کے دستخط لکھنے سے کسی کی بھی ملازمت سے جا جاتے۔ لیکن انہوں نے بعض کارکنوں کی غلطیاں معاف کیں۔ انہوں نے کسی کے خلاف کارروائی نہیں کی جس کے نتیجے میں کئی کارکنوں میں نظم و ضبط اور دفتر کی پابندی کا بحران پیدا ہو گیا۔ دراصل وہ اس کے حق میں نہیں تھے کہ ملازموں کو پابند کیا جائے۔ چوبیس گھنٹے تک پابند کر رکھا جائے۔ ان کا نظریہ یہ تھا کہ کام پورا ہونا چاہیے خواہ کوئی پابندی کر رہا ہو یا تین گھنٹے کی۔ اس سے دفتر کی نظم و ضبط بری طرح متاثر ہوا جو آخر تک نہیں سنبھلا۔ البتہ جب دفتر میں آمد و رفت کے لئے حاضری رجسٹر ہو گئے تب جا کر حاضری کی تھوڑی بہت پابندی ہوئی۔

انسانی خوبیاں

موہن چراغی میں صحافیانہ خوبیاں بھی تھیں اور انسانی خوبیاں بھی۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کام سے جی نہیں چراتے تھے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ آخری عمر میں بھی وہ کسی بھی سب ایڈیٹر یا شفٹ انچارج سے زیادہ کام کرتے تھے۔ اور انگلش رائٹنگ کے علاوہ ترجمہ بھی بہت کرتے تھے اور ہم لوگوں کو بار بار تلقین کیا کرتے تھے کہ ترجمہ کرنا مت چھوڑو ورنہ عادت خراب ہو جائے گی اور پھر کر نہیں پاؤ گے۔ جو لوگ ان کی اس بات پر عمل نہیں کرتے تھے ان کو بھی یہی تلقین کیا

کرتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ ڈیسک کے تمام لوگ باہر نکل جاتے تھے چائے پینے یا دل
بہلانے اور وہ اپنی میز پر ڈٹے رہتے تھے۔ کوئی باہر کا آدمی آجاتا تو اسے بڑی حیرت ہوتی کہ یہ
کیسا ایڈیٹر ہے کہ اکیلے ہی بیٹھ کر کام کیے جا رہا ہے۔ ملکی یا بین الاقوامی سطح پر جب بھی غیر معمولی
حالات ہوتے تو ان کے اندر بھی غیر معمولی سرگرمیاں شروع ہو جاتیں اور ایسے مواقع پر وہ ایک
ایک بات کا خیال رکھتے تھے اور یہ دیکھتے تھے کہ خبر میں کوئی چیز چھوٹنے نہ پائے۔ آخری دنوں میں
اگرچہ ان کی دلچسپی کم ہوگئی تھی تاہم وہ سب ایڈیٹروں اور رپورٹروں سے زیادہ کام کرتے تھے۔
چھٹی کے دنوں میں تو یوں بھی ہوتا کہ وہ سات بجے شام کو گھر گئے ہیں اور کوئی اہم خبر آگئی تو یا تو خود دفتر
آجاتے اور رات گئے تک کام کرتے یا پھر گھر سے ہی تیار کر کے یا تو ٹیلیفون کر دیتے یا چپراسی
یا ڈرائیور کے ہاتھ بھجوا دیتے۔ ڈیسک پر ہمیشہ دوسروں کو کچھ نہ کچھ بتاتے رہتے تھے اور مجھے اس
وقت فخر محسوس ہوتا ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے۔

بات ان کی عادت تھی کہ کسی وقت بے رخی ہو جاتی اور ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کشمیر کے بارے
میں اور پاکستان کے خلاف زیادہ سے زیادہ چیزیں چھاپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ان کی مجبوری
تھی۔ چونکہ ہندی اخبار میں ان کے بہت قریبی مکان اور بہت اچھی ... میری کوششوں سے تبادلہ ہو کر
سے ان کا تعلق رہا تھا اس لیے ان کے خلاف ہندوستان کی حکومت کا ایک حصہ ان پر شک کرتا تھا۔ ان
سے باوجود تعلقات کے چند کشمیری رہنما ان سے ملنے اکثر دفتر آیا کرتے تھے۔

ان کی انسانی خوبیوں کا معترف میں نے کئی آدمیوں کو پایا۔ جس کی تنخواہ کم تھی وہ ایک
ایک سے بات میں معلوم کرتے تھے اور اگر یہ پتہ چل جاتا کہ فلاں شخص کو نہیں ملے تو اس کی تنخواہ
اپنی جیب سے دیتے یا کسی شخص سے بھجوا دیتے اور یہ سمجھتے کہ اس کو ضرورت ہوگی۔ میں نے
خود کئی بار دوسروں کی تنخواہیں چودھری صاحب کے کہنے پر ان کے گھر پہنچائی ہیں۔ عموماً تنخواہ
سے زیادہ ایڈوانس ان سے لینے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ ضرورت ہوتے ہر وقت اپنی تنخواہیں منسوب
کرتے رہتے۔ جوں ہی کوئی کارکن دفتر میں حسب خواہ وقت سے کئی دن پہلے ضرورت بتاتا تو اسے
فوراً دیتے۔ اپنی تنخواہ سے وہ صرف اتنا ہی رکھتے جتنی ان کو اس وقت ضرورت ہوتی۔ ان سے قرض
لینے والے تو روز وصول کرتے۔ لیکن اس بات کا خاص خیال رکھتے کہ کسی کو اس قرض اور

اس کی ادائیگی کے بارے میں کانوں کان خبر نہ ہونے پائے۔ قومی آواز بند ہونے کے بعد ہم لوگ ان سے ملنے جب بھی ان کے گھر جاتے وہ باتوں باتوں میں یہ ضرور پوچھتے کہ دفتر بند ہونے پر معاوضے کے طور پر جو پیسے ملے تھے ان کا تم نے کیا کیا۔ کسی بہتر اور محفوظ جگہ پر ان کا استعمال کیا یا یوں ہی اڑا دیا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی دہلی سے باہر ہے اور وہاں سے بذریعہ فون ان کی خیریت دریافت کر رہا ہے اور ان کو پتہ چل گیا کہ وہ بیرون دہلی سے فون کر رہا ہے تو ڈانٹ دیتے کہ وہاں سے فون کرنے کیوں پیسہ برباد کر رہے ہو۔ جب یہاں آنا تب معلوم کر لینا۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ اگر کسی سے ناراضی ہوتی ہے، جو کہ عموماً ہوتی رہتی تھی، تو وہ زیادہ دن خفا ہوئے نہیں رہ پاتے تھے اور کسی نہ کسی بہانے اس سے ضرور بات کرتے تھے۔ بعض اوقات تو کچھ لوگ ان سے بدتمیزی سے بھی پیش آ جاتے اس کے باوجود وہ زیادہ دنوں تک ناراض نہیں رہتے۔

بہر حال موہن چراغی ایک ایسے صحافی تھے جن کی زندگی ہجرت میں گزری۔ البتہ انھوں نے اپنی پوری صحافتی زندگی قومی آواز کو دے دی۔ انھوں نے قومی آواز کے علاوہ کسی اور اخبار میں ملازمت نہیں کی۔ انھوں نے حالات کے جبر کے آگے جھکتے ہوئے کشمیر کو خیر باد کہا تھا اور دہلی میں سکونت اختیار کی تھی۔ لیکن وہ یہاں اپنا کوئی گھر نہیں بنا سکے۔ پہلے سرکاری فلیٹ میں رہے۔ پھر کرائے کے فلیٹ میں اور پھر اپنی بیٹیوں کے فلیٹ میں رہتے رہے۔ پیدا کشمیر میں ہوئے، کرم بھومی دہلی کو بنایا اور آخری سانس کلکتہ میں لی۔ جہاں ان کی بھی سسرال ہے اور ان کی بیٹی کی بھی۔ ان کی موت پر جو پہلا جملہ میری زبان سے نکلا وہ یہ تھا کہ آج صحافت کا چراغ گل ہو گیا۔

رضوان احمد: گویائی سے خاموشی تک

جب [illegible] 2011 [illegible] بعد [illegible] مغرب [illegible] ہمارے دوست عطا عابدی نے یہ منحوس
خبر [illegible] رضوان احمد صاحب اب اس دنیا میں نہیں رہے تو کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ یہ خبر
[illegible] جب سے دہلی کے ایک اسپتال میں جگر کے
[illegible] کا اندیشہ [illegible]
[illegible] تک ان سے فون پر بات ہوتی رہی تھی۔ آخری گفتگو میں بھی
[illegible]
[illegible] مشکل تھا کہ وہ ان چند دنوں [illegible]
[illegible]
[illegible] لیکن ان کے انتقال کے بعد کئی دنوں تک میں [illegible] امید [illegible]
[illegible] ہمت ہی نہیں ہوئی تھی۔ سوچتا تھا [illegible]

ہے سوائے چند رسمی جملے ادا کرنے کے۔ لیکن بہرحال رسمی جملوں کی ادائیگی بھی رسم دنیا ہے اور خواہی نخواہی یہ رسم ادا کرنی ہی پڑتی ہے۔ حالانکہ ایسے وقت میں پرسہ دینے والا خود کو بہت بے بس اور لاچار محسوس کرتا ہے یہی ہوتا ہے۔ چونکہ رضوان صاحب کئی برس تک پنڈت وائس آف امریکہ اردو سروس کی نمائندگی کرتے رہے ہیں اس لیے انتقال کی اطلاع میں نے فوراً وائس آف امریکہ کو ٹیلی فون کر دی۔ دو تین روز بعد وہاں سے سینئر نیوز براڈ کاسٹر اور ہم دونوں کے مشترکہ دوست رشی احمد رضوی کا فون آیا اور انھوں نے بہت سی تفصیلات معلوم کرکے ایک تعزیتی مضمون قلمبند کیا جو وائس آف امریکہ کی اردو ویب سائٹ پر پوسٹ ہوا۔

اکلوتے بیٹے کی موت کا صدمہ

رضوان صاحب سے راقم الحروف کا تعلق تقریباً پندرہ برسوں سے تھا۔ فروری 2002 میں گجرات میں ہونے والے مسلم کش فسادات کے بعد جب وائس آف امریکہ اردو نے ہندوستان میں اپنی نشریات کو فروغ دینے کے لیے نمائندوں کی تقرری کی تو پنڈت ان کی تقرری عمل میں آئی جو تقریباً آخر وقت تک جاری رہی۔ ان سے ملاقات تو اس تقرری سے پہلے سے تھی لیکن قربت اس کے بعد ہی پیدا ہوئی۔ فون پر تو مسلسل گفتگو ہوتی رہتی، وہ جب بھی دہلی آتے تو ملاقات کرتے اور ہم دونوں کی مجلس جمتی تھی۔ 2008 میں ان کے اکلوتے بیٹے محسن کا داخلہ جامعہ ہمدرد میں ہو گیا تھا۔ انھوں نے مجھے فون کیا کہ محسن کے لیے کوئی کمرہ کرائے پر دلوا دوں جو جامعہ ہمدرد سے قریب ہو۔ میں نے اپنے ایک دوست ضیاء الدین انصاری سے، جو کہ ایم ٹی این ایل میں [illegible] میں [illegible] جامعہ ہمدرد سے قریب [illegible] محسن کے مکان کے سلسلے میں بات کی۔ انھوں نے اپنے ایک اور مکان میں [illegible] محسن وہاں رہنے لگے [illegible] بعد [illegible] آنے جانے لگے۔ اسی درمیان 2009 میں وہ بیمار [illegible] [illegible] [illegible] واپس [illegible] [illegible] چھوڑ کے [illegible] لیکن امتحان کی تیاریوں کے سبب [illegible] [illegible]

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو "ہائیڈرین" ہو گیا۔ ان پھوڑوں کے توسط سے پورے جسم میں زہر پھیل گیا اور پہلے دہلی اور پھر پٹنہ میں علاج کا کوئی فائدہ نہیں ہوا اور یکم جنوری 2010 کو جواں سال سفیان کا انتقال ہو گیا۔ رضوان صاحب کا کالم "مجھے بولنے دو" بہت مشہور تھا اور ملک کے مختلف اردو روزناموں میں شائع ہوتا تھا۔ سفیان کے انتقال کی پہلی برسی پر انھوں نے جو مضمون لکھا تھا اس کا عنوان انھوں نے رکھا تھا "مجھے چپ رہنے دو"۔

سفیان کے چلے جانے کے بعد وہ، ان کی اہلیہ اور ان کی اکلوتی بیٹی ارم سب اندر سے ٹوٹ گئے تھے لیکن رضوان صاحب جس تحمل سے کام لیتے تھے وہ ان کے بلند حوصلے کی زندہ مثال تھی۔ سفیان کے جانے کے بعد وہ بیمار رہنے لگے۔ ان کو پیلیا ہو گیا جو چھ سات مہینے تک ٹھیک نہیں ہوا۔ پٹنہ میں ڈاکٹروں نے بتایا کہ ان کا جگر خشک ہو گیا ہے اور اس کا علاج لکھنؤ میں ہو سکتا ہے یا دہلی کے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز (ایمس) میں۔ وہ دہلی آئے اور جامعہ نگر، ذاکر نگر میں اپنے ایک رشتے دار کے گھر ٹھہر گئے۔ وہیں ان سے اکثر ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ایمس کے ڈاکٹروں نے پہلے تو کہا کہ آپریشن سے مرض ٹھیک ہو جائے گا لیکن بعد میں ڈاکٹروں کے پینل نے متعدد ٹیسٹ کے بعد آپریشن نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ دراصل ان کو جگر کا کینسر ہو گیا تھا جس کی وجہ سے جگر کا ستر فیصد یا اس سے زیادہ خشک ہو گیا تھا۔ ان کو جگر خشک ہونے کی بات تو بتائی گئی لیکن کینسر کے بارے میں نہیں بتایا گیا۔ انھیں ایمس کے پرائیویٹ وارڈ میں داخل کر دیا گیا اور ایک مہینے سے زائد مدت تک وہ وہاں رہے۔ وہاں ان کے مختلف ٹیسٹ ہوتے رہے اور بالآخر ڈاکٹروں نے انھیں ڈسچارج کر دیا۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوئے۔ انھوں نے دہلی کے ہی ایک دوسرے انسٹی ٹیوٹ میں دکھایا۔ وہاں کے ڈاکٹروں نے بھی وہی بات بتائی لیکن یہ بھی کہا کہ یہ اتنا خستہ نہیں ہوا ہے جتنا کہ ایمس کے ڈاکٹروں نے بتایا ہے۔ انھوں نے آپریشن کا فیصلہ کیا لیکن شکم چاک کرنے کے بعد ان کو احساس ہوا کہ یہ کیس آپریشن کے لائق نہیں تھا۔ بہر حال آپریشن کے چند دنوں کے بعد ان کو چھٹی دے دی گئی اور ان کے عزیزوں سے کہہ دیا گیا کہ انھیں گھر لے جائیں۔ جس روز ان کو گھر جانا تھا، راقم الحروف اور انصاری صاحب نے نیر منزل جا کر ان سے ملاقات کی۔ اس وقت بھی ان کے انداز گفتگو میں کوئی فرق نظر نہیں آیا۔ ہمیشہ کی

طرح اردو اخباروں اور ملکی و بین الاقوامی سیاست پر گفتگو کرتے رہے۔ یہ تقریباً تین ماہ پہلے کی بات ہے۔ رضوان صاحب سے میری آخری ملاقات تھی۔

متعدد خوبیوں کے مالک

مرحوم رضوان احمد متعدد خوبیوں کے حامل تھے۔ وہ ایک صحافی، ادیب، افسانہ نگار اور تنقید نگار تو تھے ہی، ایک بہت اچھے انسان بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جو ان سے ایک بار مل لیتا ان کا دوست بن جاتا۔ قدرت نے انہیں محبت آمیز گفتگو اور خلوص کے پیکر میں ڈھالا ڈھلایا مزاج ملنے والوں کے لیے مفید ہوتا۔ اس میں سال بعد بھی کوئی ملتا تو اس وہی اپنائیت ملتی جو پہلے تھی۔ وہ اپنی نیک نیتی، انکساری، ہمدردی اور روا روی میں رچی بسی انسانیت کی وجہ سے صداقتوں اور دوستوں کے حلقوں میں کافی مقبول اور معزز تھے۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کا فن جانتے تھے اور ہر شخص سے بات کرنے کے ہنر میں یکتا تھے۔ اردو ادب کے روایتی حریفوں پروفیسر گوپی چند نارنگ اور شمس الرحمن فاروقی دونوں سے ان کے مراسم تھے۔ وہ کسی بھی گروپ کے ساتھ بندھ کر رہنا پسند نہیں کرتے تھے اور زندگی کی کشمکش میں بھی دل سے کام لیتے تھے۔ سیاست دانوں سے بھی ان کے بہت اچھے مراسم تھے اور ادیبوں، صحافیوں اور شاعروں سے بھی دوستی تھی۔ وہ جتنا عمدہ سیاسی مضمون لکھتے تھے اتنی ہی معیاری ادبی مضمون بھی لکھتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے انتقال سے صحافت کے ایک عہد کا خاتمہ تو ہوا ہی ہے ادبی دنیا بھی اپنے ایک ذی علم سپوت سے محروم ہو گئی ہے۔

ممبئی کے اردو روزنامہ "اردو ٹائمز" کے سابق اگزیکٹو ایڈیٹر اور لکھنؤ کے روزنامہ "اودھ نامہ" کے موجودہ گروپ ایڈیٹر عالم نقوی نے ان کے انتقال پر ایک پرسوز اداریہ تحریر کیا اور بجا طور پر لکھا کہ ان کا میدان تحریر صرف عصری، سیاسی، سماجی موضوعات ہی نہیں علم و ادب بھی تھا۔ ان کے ادبی و تنقیدی مضامین اور افسانوں کے دو مجموعے ان کا بیش بہا ورثہ ہیں۔ انھوں نے جیسی سرگرم ادبی و سماجی زندگی گزاری بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ ابھی ان کے سیکڑوں کام، ادبی مضامین اور افسانے کئی ضخیم اور وقیع کتابوں میں تبدیل ہونے کے منتظر ہیں جو اپنے عہد کی تاریخ

وہ مستند حوالہ بھی ہیں۔" عالم نقوی نے ان کے بارے میں ان کے کالم کے حوالے سے لکھا کہ "مجھے بولنے دو" کی صدا گنگ ہو گئی اور اردو کا مجاہد خاموش ہو گیا۔

وائس آف امریکہ واشنگٹن کے جناب رفیع احمد رضوی ان سے اپنی ملاقات کے لمحات کو یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "رضوان احمد سے ہماری ملاقات پٹنہ میں ہمارے مشترک دوست اور کرم فرما جناب مرحوم فضل امام اور مولانا صدیقی کے توسط سے 1998 میں ہوئی تھی۔ کافی طویل گفتگو رہی اور ہم ان سے ان کی نرم گفتاری اور خلوص کا ایک تاثر لے کر اٹھے جس نے ہمیں ہمیشہ کے لیے ان کا گرویدہ بنا دیا۔ اس بات کا بالکل اندازہ نہیں تھا کہ پہلی ملاقات دراصل آخری ملاقات ہوگی اور فضل بھائی، رضوان بھائی اور ان کے احباب کی شگفتہ باتیں کانوں میں گونجتی رہ جائیں گی۔" انھوں نے وائس آف امریکہ کی اردو ویب سائٹ کے لیے متعدد ادبی مضامین لکھے تھے جو انتہائی معیاری تھے اور جن کی تعداد بہر حال سو سے زیادہ ہوں۔

رضوان احمد بہار کے معروف شاعر جناب اختر ... کے بیٹے تھے اور ان کی پیدائش دسمبر 1947ء میں بہار شریف میں ... ہوئی تھی لیکن انھوں نے پٹنہ کو اپنا مسکن بنا لیا تھا۔ ان کی صحافتی زندگی کا آغاز پٹنہ کے روزنامہ عظیم آباد ایکسپریس سے ہوا تھا۔ ان کا معروف کالم "مجھے بولنے دو" روزنامہ قومی تنظیم پٹنہ اور جدید قومی ... میں پابندی کے ساتھ شائع ہوتا رہا ہے۔ ممبئی کے روزنامہ انقلاب اور دیگر اخباروں اور ادبی رسالوں میں بھی ان کے مضامین چھپتے رہتے ہیں۔ انھوں نے پٹنہ یونیورسٹی سے "آزادی کے بعد اردو صحافت" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی تھی اور ان کی تصنیفات میں "یونان کی شہزادی"، "مسدود راستوں سے ..."، "فصیل شہر" اور "مجھے بولنے دو" خاصے مقبول ہوئے تھے۔ وہ صحافتی سرگرمیوں میں پیش پیش رہتے تھے۔ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے اور 1996 میں اس کے تنظیمی سکریٹری بنائے گئے تھے۔ انھیں اتر پردیش، بہار اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیوں نے ایوارڈوں سے نوازا تھا۔ وہ بہار اردو اکیڈمی کے دو بار سکریٹری بھی رہے۔ ان کا انتقال جہاں ان کے پسماندگان کے لیے ایک عظیم خسارہ ہے وہیں اردو صحافت اور ادب کا بھی بڑا نقصان ہے۔

باب سوم:

چند تصنیفات، ایک نظر

کلکتہ کی اردو صحافت اور میں

(رضوان اللہ)

رضوان اللہ کی مذکورہ تصنیف کلکتہ کی اردو صحافت کے تعلق سے ایک تاریخی دستاویز ہے۔ انھوں نے اس کتاب کی مدد سے نہ صرف کلکتہ کی اردو صحافت کے نشیب و فراز سے اردو قارئین کو واقف کرانے کی کوشش کی ہے بلکہ اپنی صحافتی زندگی کی ناہمواریوں سے بھی روبرو کرایا ہے اور شاید انھوں نے ان دونوں پہلوؤں سے نئے اردو صحافیوں کو ایک سبق بھی دینے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے کتاب کی ابتدا خدائے سخن میر تقی میر کے ایک عبرت انگیز شعر کو استعمال کرتے ہوئے کی ہے۔ میں سب سے پہلے اس اقتباس کو جو کتاب کا پہلا اقتباس ہے اور جس میں اس شعر کا استعمال کیا گیا ہے، پیش کرنا چاہوں گا: "یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ کلکتہ میں برسات کا شباب اتار پر تھا لیکن آسمان کی ہوا و بارش کی جھڑی سے ہر طرف کیچڑ جمع ہو جاتی تھی۔ میں پہلی بار کلکتہ کی اردو صحافت سے وابستہ ہونے کی غرض سے آیا تھا۔ جیسے میر کا یہ بیت کا سرنامہ بن گیا تھا اور یہ بھی ہوا کہ زندگی کی گھٹن سے جو میں شکست خوردگی محسوس کی ہے اس سے ہوا اور خواں شکستوں سے پر تھا اور وہ بھی مجھ سے کہنے کو کہہ رہا تھا۔ میں بھی بچھ سکا نہ پر غور کرتی۔"

دراصل یہ صرف اقتباس نہیں بلکہ پوری کتاب کا نچوڑ ہے کہ کلکتہ کی اردو صحافت کا نچوڑ ہے۔ پوری کتاب میں ان چند سطروں کی تشریح پیش کی گئی ہے۔ اگر اس کی تشریح نہ بھی کی گئی ہوتی تب بھی یہ چھوٹا سا اقتباس کلکتہ کی اردو صحافت پر ایک بھرپور تبصرہ ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس اقتباس میں جو درد و کرب اور سوز و گداز ہے وہ پوری کتاب میں بھی موجود ہے۔ البتہ انھوں نے یہ سوچ کر کہ قارئین بور نہ ہو جائیں یا بہت زیادہ رنجیدہ نہ ہو جائیں اپنی ظرافت طبع کا استعمال کیا

[illegible] اپنے جسموں کی [illegible] بھی چھوڑی ہیں۔

کلکتہ شہر، وہاں کی صحافت اور وہاں کی تہذیب و ثقافت رضوان اللہ کی شخصیت اور مزاج میں رچی بسی ہیں۔ اس شہر سے ان کا چونکہ 24 برسوں تک تعلق رہا ہے اس لیے دہلی آکر بھی وہ اس کو فراموش نہیں کر سکے۔ یہی محبت تھی کہ کبھی "اوراق مصور" کے عنوان سے مثنوی لکھ کر کلکتہ سے اپنے قلبی [illegible] کا ثبوت دیتے ہیں تو کبھی کلکتہ کی اردو صحافت پر کتاب تصنیف کر کے یہ بتانے کی کوشش کرتے ہیں [illegible] آخری [illegible] بھی کلکتہ شہر، جس پر غالب فریفتہ ہوئے تھے، [illegible] چھایا ہوا [illegible] انھوں نے 1991 میں آخری بار کلکتہ دیکھا تھا [illegible] اوراق پر [illegible] انھیں اب بھی اس شہر نگاراں سے وہی انسیت [illegible] تھی۔ شاید یہی محبت [illegible] مجبور ہوئے "کلکتہ سے میرا جو رشتہ [illegible] قلبی تھا [illegible] شکست تھا"۔ 1951 سے 1975 تک کا ایک [illegible] کلکتہ میں [illegible] اخبارات کو اپنا خون جگر پلایا۔ ان چوبیس برسوں میں [illegible] کا عنوان [illegible] تدریجی [illegible] اخبارات [illegible] پھر بھی وہ کلکتہ اور وہاں کی صحافت سے [illegible] کتاب کے سطور اور [illegible] کلکتہ کو خیر باد کہنے کے بعد رضوان اللہ صاحب نے دلی میں [illegible] بیورو میں ملازمت اختیار کی [illegible] گورنمنٹ سے ایک [illegible] قبل ان کی [illegible] کلکتہ [illegible] لیکن [illegible] سکون سے [illegible] جا سکے۔ دل کی بیماری نے ان کے [illegible] میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اس واقعہ [illegible] وشمار [illegible] مسلسل استعمال کی وجہ سے [illegible] کمزوری آ گئی تھی [illegible] وہ تو دفتر والوں کی انتہائی مہربانی تھی [illegible] گورنمنٹ تک پہنچنے کے لیے درکار دس دن کی مدت گزار لی، وہ کوئی عصر جدید کا فرشتہ تو تھا نہیں جہاں اٹھارہ برس کاٹنے کے بعد [illegible] بیماری کی حالت میں [illegible] واجبات [illegible] ایک پیسہ نہیں دیا

کیا"۔

ان کا آخری جملہ صرف عصر جدید پر ہی نہیں بلکہ کلکتہ کی صحافت پر ایک بھرپور طنز آمیز تبصرہ ہے۔ انھوں نے ہمت جٹائی اور اپنے درد و کرب کو خوبصورت انداز میں بیان کر دیا۔ بہت سے لوگ تو اس کی جرات بھی نہیں کر پاتے۔ ایسے واقعات جگہ جگہ بکھرے پڑے ہیں جو ان کے 21 سالہ صحافتی سفر میں نشان عبرت بن کر رہ گئے ہیں۔

"کلکتہ کی اردو صحافت اور میں" صرف کلکتہ کی اردو صحافت کا تجزیہ نہیں بلکہ اس کے ہوتے ہوئے مسلم معاشرے کا ایک تجزیاتی مطالعہ بھی ہے۔ تقسیم وطن کے بعد جو میں اس معاشرے کی شکست و ریخت، صحافت کی بے زبانی اور بے سمتی، مسلمانوں کی سیاسی بے وزنی و بے اثری، اداروں کی شکست اور غیر یقینی مستقبل پر ایک بے لاگ بے باک تبصرہ بھی ہے۔ اس کتاب میں جو عنوانات قائم کیے گئے ہیں ان سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ صاحب کتاب نے دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ عنوانات ملاحظہ ہوں 1947 کا انقلاب اور مسلم سیاست، مضمحل صحافت اور رد عمل، قومی تذکرہ مسلم اداروں کا حشر، بہار میں خزاں کا، پریس کمیشن کا قیام، نئے دور کا آغاز، بنگلہ دیش کی تحریک، مسلمانوں کی واپسی، جنگ کے اثرات، ایمرجنسی اور سنسرشپ، بنگلہ دیش میں انقلاب، اردو نیوز سروس، ایجنسی اور پریس، پینٹنگ و فروغ اردو اور اس فاؤنڈیشن وغیرہ۔

اس کتاب کو چار ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ دوران میں کئی عنوانات باندھ کر کلکتہ کی اردو صحافت کے پیچ و خم داری کرتیں خوانے کی کوشش کی گئی ہے۔ عصر جدید، اتحاد، روزانہ ہند، امروز، نگار، اخوت، ایشیا، سندیش، نبض، ایشیا، فانوس، ڈاکٹ، اخبار مشرق، سیاست، آزاد ہند، آبشار، غازی، عکاس، بدل، آسمان، مژدہ، مورچہ، منگلیت، مشرقی ہند، آزاد ہند، اسپورٹس ٹوڈے، اسپورٹس انڈین، محرک اور طاقت وغیرہ اخبارات و رسائل میں سے بعض کا تفصیلی ذکر ہے اور بعض کا مختصر۔ ان اخبارات کی تاریخ اجرا بھی ساتھ ساتھ درج کی گئی ہے اور وہاں کے کارکنوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

جیسا کہ ہم سبھی جانتے ہیں کہ اردو صحافت کا آغاز کلکتہ سے ہوا ہے اور اسی لیے انھوں نے کلکتہ کو اردو صحافت کی مہد اور لحد دونوں کہا ہے۔ اردو اخبارات کے پچھڑے دور پر بھی انھوں نے روشنی

ذاتی [illegible] اور میونزم کی صحافت کو بھی موضوع گفتگو بنایا ہے۔ پھر [illegible] کے دور میں پیش آنے والی دشواریوں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے کلکتہ کی اردو صحافت کے سلسلے میں عہد نو کے عنوان سے بھی ایک حصہ شامل کیا ہے جس میں روزنامہ اخبار مشرق پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں "1980ء سے قبل [illegible] اخبار مشرق کی اشاعت سے کلکتہ میں آفسیٹ مشین پر اردو اخباروں کی اشاعت کا آغاز [illegible] میونزم [illegible] رواج کو ابھی مزید بیس برس باقی تھے۔ اس کے [illegible] اخبار مشرق [illegible] ایڈیشن بھی جاری [illegible] کلکتہ کے اخباروں میں اخبار مشرق [illegible] حاصل ہے۔" اس ضمن میں انھوں نے اخبار مشرق کے مدیر [illegible] مزاج [illegible] بھی پیش کیا ہے۔ بقول ان کے کلکتہ کے اردو [illegible] وسیم الحق [illegible] تھے [illegible]

[illegible] صحافت [illegible] انتصیا جہاں دیدہ اردو صحافت کی بھی [illegible]

[illegible] کلکتہ کا [illegible] مصنف کو ندرہا ہو اس کے باوجود انھوں نے کلکتہ [illegible]

ابلاغیات

(پروفیسر شاہد حسین)

[illegible] ترسیل [illegible] تعریف [illegible] ترسیل کی [illegible]
[illegible] ترسیل کی ارتقا کی تاریخ صحافت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کی بنیادی کارکردگی
اس کی تعریف [illegible] اہمیت [illegible] ابتدا اور ارتقا اور دیگر متعلقہ باتوں پر تفصیل سے [illegible]
[illegible]
[illegible] کتاب میں [illegible]
[illegible] کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے [illegible] دراصل یہ تحقیق کا
موضوع ہے اور ڈاکٹر شاہد حسین نے اس ضمن میں تحقیق کا حق [illegible]

ابلاغیات [illegible] ترسیل [illegible]
[illegible] ترسیل کی مختلف [illegible] کے ترجمی اور اس کی ابتدا، ارتقا، زبان کی ابتدا، تحریر
[illegible]

[illegible] صحافت [illegible] اس میں صحافت کی تعریف، اس کی تاریخ [illegible]
[illegible] صحافت کی [illegible]
خبرات [illegible]
جہاں نما" سے لے کر "مدینہ" تک کے اخبارات اور ان کے مدیروں کی خدمات کا جائزہ
[illegible]
[illegible]

تیسرا باب ریڈیو کی ابتدا اور ارتقا سے متعلق ہے۔ ریڈیو سے قبل کے ذرائع ابلاغ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ تقسیم ہند سے قبل کے ریڈیو اسٹیشن، بعد کے اسٹیشن اور بی بی سی ریڈیو پر تفصیل سے اظہار خیال کیا گیا ہے۔ آخری باب ٹیلی ویژن اور اس کی ارتقا سے متعلق ہے جس میں ٹیلی ویژن کی ابتدا، ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی ابتدا اور ارتقا، ٹی وی چینل، اسکرپٹ نگاری اور ٹیلی ویژن کی اصناف کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔

اردو اخبارات کے ضمن میں جام جہاں نما، دہلی اردو اخبار، سید الاخبار، صادق الاخبار، کوہ نور، خیر خواہ ہند، قران السعدین، فوائد الناظرین، اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، تہذیب الاخلاق، اودھ پنچ، مرقع اخبار کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا حسرت موہانی اور اردوئے معلی اور محمد علی جوہر اور ہمدرد اخبار سے متعلق بھی بیش قیمت معلومات فراہم کی گئی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال پر اظہار خیال کرتے ہوئے شاہد حسین لکھتے ہیں کہ ابوالکلام آزاد نے گیارہ سال کی عمر میں کلکتہ سے نیرنگ عالم جاری کیا۔ اس کے بعد المصباح اور لسان الصدق سے بھی ان کی صحافتی خدمات وابستہ رہیں۔ انھوں نے کم و بیش ایک درجن اخبارات ایڈٹ کیے۔ ان میں الہلال سب سے منفرد اور نمایاں رہا، جو انھوں نے 1912ء میں کلکتہ سے جاری کیا۔ یہ ہندوستان کا پہلا مصور سیاسی ہفت روزہ تھا۔ بقول مولانا امداد صابری یہ اخبار چھپ کر [illegible] کے بعد حکومت کی کوئی قید نہیں رہی۔ یہ اخبار اپنی اشاعتی زندگی میں تین ادوار سے گزرا۔ 1912ء سے شروع ہو کر نکلتا اور بند ہوتا رہا اور 1927ء میں مکمل طور پر بند ہو گیا۔ اردو اخبارات و رسائل سے متعلق باب بھی دوسرے ابواب کی مانند انتہائی معلوماتی ہے اور اردو صحافت سے وابستہ افراد اس سے زبردست استفادہ کر سکتے ہیں۔ صحافت کے پیشے میں جانے سے قبل جن باتوں سے واقفیت ہونی چاہیے وہ سب اس میں موجود ہیں۔

مصنف نے اس کتاب میں معروف نیوز ایجنسیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ انھوں نے یو این آئی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ 1961ء میں شروع ہوئی اور اس وقت پانچ سو سے زائد اخبارات و ادارے اس سے خبریں حاصل کرتے ہیں۔ جبکہ پی ٹی آئی پانچ ہزار کی لاگت سے شروع ہوئی تھی اور آج یہ پانچ کروڑ کا کاروبار کرتی ہے۔ لیکن مصنف نے یو این آئی کی اردو

سروس کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔

اس کتاب میں ریڈیو سے متعلق بھی بہت معلوماتی باتیں درج ہیں۔ ہندوستان میں ریڈیو کی ابتدا اور ارتقا پر تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔

اسد تابعد حسین نے اس کتاب میں ریڈیو نشریات کے سلسلے میں کچھ قابل قدر معلومات فراہم کی ہیں لیکن انھوں نے اردو نشریات کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔

تعارف وتنقید

(ڈاکٹر خواجہ اکرام)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر ڈاکٹر خواجہ اکرام علمی وادبی دنیا کا ایک معروف نام ہے۔ یہ ان ادیبوں اور قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں جن سے ادبی دنیا کو بہت توقعات ہیں۔ ان کی ایک کتاب "تعارف وتنقید" جو مختلف موضوعات پر مختلف مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس میں کل پندرہ مضامین ہیں جن میں سے چار اردو زبان اور میڈیا سے تعلق رکھتے ہیں اور باقی تنقیدی مضامین ہیں۔

ڈاکٹر خواجہ اکرام جے این یو میں اردو کے استاد ہیں اور میڈیا شعبے سے بھی جڑے رہ چکے ہیں۔ تنقیدی مضامین کے مجموعے تو بہت شائع ہوتے ہیں لیکن میڈیا پر مضامین کم آتے ہیں (خاص طور پر اردو میں) کم ہی چھپتی ہیں۔ اب اردو کے دانشوروں نے اس جانب توجہ دی ہے اور اردو میں بھی کتابیں آنے لگی ہیں۔ لیکن ابھی بھی یہ رفتار سست ہے۔ ادبی مضامین پر تنقیدی تحریریں تو بہت سی مل جاتی ہیں لیکن اس لیے خواجہ صاحب کے تنقیدی مضامین میں میری دلچسپی اردو میڈیا سے متعلق مضامین میں زیادہ ہے۔ موجودہ زمانہ میڈیا کا زمانہ ہے۔ میڈیا کے سبب ہی میں آئے انقلاب نے پوری دنیا کی توجہ اس جانب مبذول کرائی ہے۔ میڈیا کا ایک اہم حصہ انٹرنیٹ ہے۔ اور آج دنیا بھر میں انٹرنیٹ کا استعمال اس قدر ہونے لگا ہے کہ شاید ہی کوئی اور میڈیا ٹی وی کو چھوڑ کر لوگوں تک اتنی رسائی رکھتا ہو۔ انٹرنیٹ سے اردو کا تعلق کتنا اور کیسا ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ خواجہ اکرام نے انٹرنیٹ کے ذریعہ اردو کی تعلیم کا جائزہ لیا ہے۔ انٹرنیٹ کے ذریعہ اردو کی تدریس، تعلیم کی کیا صورت حال ہے، اس مضمون سے [illegible]

پر خاصی روشنی پڑتی ہے۔ انٹرنیٹ کی دنیا ایک ایسی وسیع وعریض دنیا ہے کہ ایک ایک موضوع پر ہزاروں، لاکھوں صفحات مل جائیں گے اور بقول خواجہ اکرام گوگل میں 141 لاکھ سائٹس ہیں اور ان سائٹس کو دیکھنا اور ان میں سے اپنے مطلب کی چیز نکالنا واقعتاً گہرے سمندر میں اتر کر موتیوں کی تلاش کرنے کے مترادف ہے۔

خواجہ اکرام نے ایک مضمون میں ان سائٹس کا تعارف کرایا ہے جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور اس سلسلے میں جو دشواریاں یا ان سائٹس میں جو خامیاں ہیں ان کو بھی اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے بی بی سی کی سائٹ کا ذکر کیا ہے اور اس کی خامیوں کو بتایا ہے۔ آخر میں انھوں نے لکھا ہے ''جدید ترین ٹکنالوجی کا استعمال اور انٹرنیٹ کے ذریعہ اردو زبان کے سیکھنے اور سکھانے کے عمل میں جو تساہل برتا جا رہا ہے وہ باعث تشویش ہے''۔ انھوں نے فارسی زبان سیکھنے کی ایک سائٹ کا بھی ذکر کیا ہے جس کے بارے میں ان کا کہنا ہے کہ ''وہ انگریزی کے ذریعے فارسی سیکھنے کی بہترین سائٹ ہے''۔ تاہم انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وسیلے کو اردو زبان اور ادب دونوں حوالوں سے استعمال کرنے کی بہت زیادہ گنجائش ہے۔ ادب کے حوالے سے تو جو کام اب تک ہوئے ہیں یا جو کچھ سامان اسپیس میں موجود ہیں وہ تشفی بخش ہیں۔ اردو ادب کی ڈیجیٹل لائبریری، ادبی وتہذیبی رسالے، اخبارات اور کتابوں وغیرہ کی مختلف سائٹس موجود ہیں لیکن اسے آخری منزل نہ تصور کیا جائے۔

حقیقت بھی یہی ہے کہ انٹرنیٹ سے اردو کی ترویج واشاعت اور اس کی تعلیم کو عام کرنے میں بہت مدد لی جاسکتی ہے۔ ضرورت حوصلہ مند محبان اردو اور سائبر اسپیس کے سیاحوں پر منحصر ذاتی وسیلے پر عام نوجوانوں کی ہے۔ اگر اس طرف توجہ دی جائے تو مستقبل کے اس انتہائی طاقتور وسیلے کو اردو کے فروغ میں بہتر طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ایک مضمون الیکٹرانک میڈیا اور اردو کے رشتے پر ہے۔ جس میں میڈیا میں اردو کے استعمال سے بحث کی گئی ہے۔ خواجہ اکرام نے جائزہ لینے کے بعد لکھا ہے کہ اردو زبان ریڈیو و ٹی وی یعنی ان دونوں ذرائع ابلاغ وترسیل پر حاوی ہے۔ تفریحی پروگراموں میں بھی اردو کے الفاظ کی کثرت مل جائے گی اور خبروں میں بھی۔ تاہم بعض اوقات دانستگی یا نادانستگی میں اردو زبان کی

جس طرح سے ملک توڑی جاتی ہے اس پر انھوں نے اظہار تشویش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ میڈیا نے اردو کے الفاظ کو کثرت سے اپنایا ہے مگر کبھی کبھی اس زبان کے ساتھ ایسا مذاق کیا جاتا ہے کہ زبردست دھچکا لگتا ہے۔

میڈیا سے متعلق چوتھا اور آخری مضمون ہے ''صحافت کے رویے اور فن''۔ اس میں صحافت کی تعریف اس کی تشریح، صحافت کے مسائل اور دیگر متعلقہ چیزوں سے بحث کی گئی ہے۔ انھوں نے صحافت کے بارے میں کئی سوالات کیے ہیں اور پوچھا ہے کہ آج صحافت کو کس مفہوم میں لیا جا رہا ہے؟ انھوں نے سوال کیا ہے کہ کیا صحافت ایک سماجی ادارہ ہے، کیا یہ ایک اقتصادی ادارہ ہے، یا صحافت طاقتور حکمرانوں کی طاقت وقوت کا آلہ ہے، یا صحافت اہل ثروت کے ہاتھوں میں کھیلنے والا ادارہ ہے اور کیا صحافت بلیک میل کرنے کا ذریعہ ہے؟ موجودہ صحافت کا اگر غیر جانبدارانہ انداز میں جائزہ لیا جائے تو پہلے سوال کو چھوڑ کر باقی تمام سوالوں کے جواب کی نشاندہی اثبات میں ملتی ہے۔ خواجہ اکرام نے ان سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور ایک جگہ بحث کرتے ہوئے بات لکھی ہے کہ اخبار کا وہ حصہ جس میں سچائی ہوتی ہے وہ صرف تاریخ کی خبریں ہیں۔ اخبار کا وہ حصہ جو صداقت پر مبنی ہوتا ہے وہ اشتہارات ہوتے ہیں اور اخبارات کا وہ حصہ جو سراسر جھوٹ پر مبنی ہوتا ہے وہ خبریں ہیں۔ اس مضمون میں رپورٹنگ، اداریہ، فیچر، کالم، آئین اور پریس قوانین سے بحث کی گئی ہے اور ان کی روشنی میں صحافت کے اصل مفہوم کو تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857

(معصوم مرادآبادی)

2007ء میں جب ملک گیر پیمانے پر 1857ء کی جنگ آزادی کا ڈیڑھ سو سالہ جشن منایا جا رہا تھا تو اردو صحافت کی جانب سے جگہ جگہ کانفرنسوں اور سیمیناروں کا بھی اہتمام کیا گیا تھا جن میں اس عہد کی اردو صحافت پر بھی مقالے اور مضامین پیش کیے گئے تھے۔ تاہم وہ بکھرا ہوا کام تھا۔ کسی نے کسی مضمون پر اظہار خیال کیا تو کسی نے کسی موضوع پر۔ اگرچہ ان میں اردو صحافت کی خونچکاں قربانیوں کو بھی اجاگر کیا گیا تھا لیکن 1857ء کی جنگ آزادی میں اردو صحافت کا جو لہو رنگ باب ہے وہ نامکمل ہی تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس جنگ کی چنگاری کو اردو صحافت کی شعلہ بیان تحریروں اور آتش فشاں اداریوں نے ہی بھڑکایا تھا اور پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف نفرت کی آگ کو آتش فشاں میں تبدیل کر دیا تھا۔ وہ اردو اخبارات ہی تھے جو جنگ آزادی کا صور پھونک رہے تھے اور مجاہدین کے دلوں میں آزادی کا الاؤ روشن کر رہے تھے۔ وہ اردو صحافی ہی تھے، جو اس جرم عظیم کی پاداش میں فرنگیوں کے ظلم و استبداد کے شکار بن رہے تھے اور اپنے جذبوں سے دار و رسن کو آباد کر رہے تھے۔

یوں تو ہندوستان کی اولین جنگ آزادی پر اردو کے کردار پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان میں کتابیں بھی ہیں اور رسائل و جرائد کے خصوصی شمارے بھی۔ لیکن ایک اہم اور مجموعی کام ابھی باقی تھا اور وہ کام معصوم مرادآبادی نے کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی کتاب ''اردو صحافت اور جنگ آزادی 1857'' ایک اہم تصنیف ہے۔ اس کتاب کا مقدمہ بزرگ صحافی جی ڈی چندن کے گہربار قلم کا مرہون منت ہے۔ جس میں انھوں نے جنگ آزادی 1857 میں اردو صحافت کے قائدانہ کردار پر کھل

روشنی ڈالی ہے۔ اس کے علاوہ مذکورہ کتاب پر بھی اپنی بیباک رائے دی ہے۔ معصوم مراد آبادی نے جہاں اس کتاب میں اردو صحافت کی خونچکاں تاریخ قلمبند کی ہے، وہیں انھوں نے اس کے حوالے سے اس عہد کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ مثال کے طور پر ''پس منظر'' کے عنوان سے انھوں نے پہلی جنگ آزادی کی بغاوت کی شروعات کن لوگوں کے لیے جدوجہد، بہادر شاہ ظفر کے آخری ایام، دہلی میں قتل و غارت گری اور ویران دہلی شہر پر قہر کے ذیلی عنوانات سے انتہائی معلومات فراہم کی ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے آخری ایام سے متعلق اقتباسات پڑھ کر بے شبہ آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ اس طرح کی شہادتیں خون کے آنسو رلاتی ہیں۔

چونکہ معصوم مرادآبادی والی کتاب کی تصنیف کی تحریک مولوی محمد باقر پر دہلی سے پہلی کتاب میں مقدمہ اور ترتیب کے بعد انھوں نے مولوی محمد باقر پر ایک تفصیلی مضمون پر قلم بند کیا ہے جو تحقیق پر مشتمل ہے۔ اس میں شہادت کا منظر، ہیرو کا قتل، مولوی باقر کا خاندان، تعلیم و تربیت، بہادر شاہ ظفر سے قربت، اور انگریز پرستی کے الزامات جیسے ذیلی عنوانات کے تحت تفصیلات پیش کی ہیں۔ معصوم مرادآبادی کے مطابق کہا جاتا ہے کہ 1857ء جب دہلی میں شورش کا آغاز ہوا تو مولوی باقر نے اپنے اخبار کو نہیں بلکہ خود کو بھی اس تحریک کے لیے وقف کر دیا تھا۔ مولوی باقر کی شہادت کے بارے میں کئی کتابوں میں لکھا گیا ہے کہ پرنسپل ٹیلر نے اپنے آخری وقت میں چند کاغذات مولوی باقر کے حوالے کیے تھے اور چاہتے تھے کہ دہلی پر انگریزوں کا دوبارہ قبضہ ہونے کے بعد جو پہلا انگریز افسر ملے اسے یہ کاغذات دے دیں۔ ان میں ایک کاغذ یہ بھی تھا کہ مولوی باقر نے میری جان بچانے کی کوشش کی ہے۔ جب انگریز افسر نے اسے پڑھا تو انھیں فوراً گولی مار دی۔ لیکن معصوم مرادآبادی نے لکھا ہے ''مولوی باقر کو جنرل ہڈسن نے اس وقت گولی نہیں ماری تھی جب وہ پرنسپل ٹیلر کا سامان لے کر گئے تھے۔ بلکہ ان کی شہادت کا واقعہ انھیں گرفتار کیے جانے کے بعد کا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ ان کو گرفتار کرنے کے بعد ان کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں چلا اور نہ ہی انھیں اپنی صفائی پیش کرنے کا موقع دیا گیا بلکہ انتہائی ظالمانہ طریقے سے انھیں 77 سال کی پیرانہ سالی میں نہایت سفاکی سے شہید کر دیا گیا۔''

آخر میں اس وقت کے اردو اخبارات کا جائزہ لیا گیا ہے جس میں صادق الاخبار، پیام

آزادی، سراج الاخبار، کوہ نور، طلسم لکھنؤ، سحر سامری، رسالہ بغاوت ہند، عمدۃ الاخبار اور چشمہ فیض شامل ہیں۔ ان میں سب سے اہم مضمون پیام آزادی سے متعلق ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں "تحریک آزادی 1857ء میں نئی روح پھونکنے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع کرنے کے سلسلے میں پیام آزادی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ بہادر شاہ ظفر کے پوتے مرزا بیدار بخت کے قلم سے اس اخبار کی اشاعت فروری 1857ء میں شروع ہوئی تھی۔ اس کے پبلشر گو کہ مرزا بیدار بخت تھے لیکن اس کے خاص نگراں عظیم اللہ خاں تھے۔ اس اخبار سے انگریز اس قدر خائف تھے کہ دہلی پر دوبارہ تسلط قائم ہونے کے بعد گھروں کی تلاشی کی جاتی اور جس کے گھر میں اس اخبار کا کوئی شمارہ مل جاتا انھیں پھانسی دے دی جاتی۔ وہ دیوناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں شائع ہوتا تھا اس لیے اسے ہندی اردو صحافت کی مشترکہ میراث بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں کوہ نور کی ایک ایسے اخبار پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو انگریزوں کا زبردست پٹھو اور حامی تھا اور جو مجاہدین وطن کو مفسد اور غدار کے القاب سے نوازتا تھا۔ اس نے دہلی پر انگریزوں کے دوبارہ قبضے کے بعد ایک خصوصی ضمیمہ شائع کیا اور انگریزوں کے جشن فتح میں تحریری طور پر شامل ہوا۔ تاہم نصف صدی سے زائد عرصہ تک نکلنے والے اس اخبار کی اردو صحافت کے تئیں خدمات کئی ہیں جن کا ذکر اس کتاب میں موجود ہے۔"

مجموعی طور پر یہ ایک ایسی دستاویزی کتاب ہے اور 1857 کی جنگ آزادی اور اردو صحافت کے موضوع پر یہ ایک ایسی تصنیف ہے جو حوالہ جاتی کتاب کے طور پر ہمیشہ رہے گی۔

اردو میں نشریاتی ادب

(ڈاکٹر شکیل اختر)

حالیہ دنوں میں میڈیا کے موضوع پر اردو میں کچھ کتابیں منظر عام پر آئی ہیں جس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میڈیا کے شعبے میں آئے انقلاب پر اردو والوں کی بھی گہری نظر ہے۔ ان کتابوں میں ڈاکٹر شکیل اختر کی کتاب "اردو میں نشریاتی ادب" بھی شامل ہے۔

اس کتاب کی اہمیت کئی حوالوں سے ہے جن میں دو حوالے بہت اہم ہیں۔ ایک تو یہ کہ یہ ریڈیو نشریات کے اصول و اسلوب سے بحث کرتی ہے اور دوسرے یہ کہ اس میں نشریاتی ادب کا ایک بڑا حصہ شامل کر دیا گیا ہے۔ کتاب کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ یہ ہیں نشریات کی تعریف، نشریات کی تاریخ، ہندوستان میں نشریات کی تاریخ، اصول و نظریات، اردو میں نشریاتی ادب کی روایت، نشریاتی ادب کا اسلوب اور مختلف نشریاتی اصناف کا جائزہ۔

پہلے باب میں نشریات کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ دوسرے باب یعنی نشریات کی تاریخ میں خصوصی طور سے امریکہ و برطانیہ میں نشریات کی ابتدا اور ترقی پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد مختلف ممالک جیسے جرمنی، آسٹریلیا، برازیل، روس، چین، جاپان، کناڈا اور فرانس وغیرہ میں ریڈیو نشریات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ اس باب میں ایک بہت اچھا حصہ دنیا بھر میں اردو نشریات سے متعلق بھی ہے جس میں ان ریڈیو سروسز سے متعارف کرایا گیا ہے جہاں سے اردو میں پروگرام پیش کیے جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا الگ سے باب قائم نہیں کیا گیا ہے اس لیے یہ انتہائی اہم حصہ دب سا گیا ہے اس کو جتنا واضح ہونا چاہیے تھا نہیں ہو سکا ہے۔ تاہم کتاب کا قاری جب اس مقام پر پہنچے گا تو اسے اندازہ ہوگا کہ وہ اردو کے تعلق

سے بہت سی اہم معلومات حاصل کر رہا ہے۔

اس باب میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں کل 19 ملکوں کے ریڈیو سے اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ پروگرام نشر ہونے کا وقت، دورانیہ اور میٹر اور کلوہرٹز کی بھی تفصیل بتادی گئی ہے۔ اس بات سے یہ اندازہ ہوا کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس دنیا کی سب سے بڑی اردو سروس ہے۔ یہاں سے یومیہ نصف گھنٹے کی اردو سروس شروع ہوئی تھی جو اب بڑھ کر چوبیس گھنٹے کی ہوگئی ہے۔ دوسرے نمبر پر وائس آف امریکہ کی اردو سروس آتی ہے جہاں سے یومیہ بارہ گھنٹے مسلسل اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ جن ملکوں سے اردو میں پروگرام نشر ہوتے ہیں وہ ہیں آسٹریلیا، افغانستان، ایران، امریکہ، برطانیہ، بنگلہ دیش، پاکستان، ترکی، جاپان، جرمنی، چین، روس، فلپائن، سعودی عرب، سوازی لینڈ، ہندوستان اور ویٹی کن سٹی وغیرہ۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پروگرام کے اوقات اور تفصیلات کے ساتھ ساتھ ریڈیو اسٹیشنوں کے مکمل پتے بھی درج کر دیے گئے ہیں۔ ہندوستان میں نشریات کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی تفصیل پیش کی گئی ہے کہ تقسیم ملک کے وقت ہندوستان میں کتنے ریڈیو اسٹیشن تھے اور اب ملک بھر میں کتنے ریڈیو اسٹیشن ہیں۔ اس باب میں آل انڈیا ریڈیو کے ان اسٹیشنوں کی بھی تفصیل درج ہے جہاں سے اردو پروگرام نشر ہوتے ہیں۔ یہاں بھی پروگراموں کی تفصیل، اسٹیشن کا نام اور دورانیہ بتایا گیا ہے۔ دنیا بھر میں انٹرنیشنل سروس، اردو ٹیلی ویژن چینل یا ٹی وی نشریات کے ڈویژن کہاں کہاں ہیں اس کی بھی تفصیل پیش کردی گئی ہے۔ نیوز سروس کے آغاز اور موجودہ صورت حال کو بھی اس میں شامل کیا گیا ہے۔ اندرون ملک کن کن اسٹیشنوں سے اردو میں خبریں نشر کی جاتی ہیں اس کی بھی تفصیل موجود ہے۔ اردو بلیٹن تیار کرنے والے علاقائی مراکز اور علاقائی اردو نیوز بلیٹن ریلے کرنے کے مراکز کی فہرست بھی شامل کتاب ہے۔ اس کے علاوہ کمرشیل براڈ کاسٹنگ اور ایف ایم چینلوں پر بھی خاصی روشنی ڈالی گئی ہے۔ عام لوگوں کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ ملک بھر میں بے شمار ایف ایم ریڈیو پروگرام نشر کرتے ہیں۔ اس میں دی گئی فہرست کے مطابق پورے ملک میں 135 ایف ایم ریڈیو ہیں جن میں دہلی اور ممبئی میں چھ چھ اور چنئی میں چار ایف ایم ریڈیو ہیں۔ یوں تو امریکہ، برطانیہ اور ہندوستان میں نشریات

کی تاریخ پر اردو کی کئی کتابوں میں تفصیلات مل جاتی ہیں لیکن پورے ملک میں جہاں جہاں اور جتنے بھی اردو پروگرام اور رپورتاژ نشر کی جاتی ہیں ان کی تفصیلات شاید ایک جگہ نہیں مل سکتے۔

ڈاکٹر شاہین اختر نے نشریات کے اصول و نظریات پر بحث کرتے ہوئے ان کے تینوں تین اہم پہلوؤں پر تفریح، اطلاعات اور تعلیم کے حوالے سے جائزہ لیا ہے۔ کتاب میں ایک اور اہم حصہ اردو نشریاتی ادب کی روایت سے متعلق ہے۔ اس باب میں بتایا گیا ہے کہ نشریاتی ادب کی ابتدا بھی اسی وقت ہوئی تھی جب ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا آغاز ہوا۔ یعنی 1936ء میں دہلی میں۔ اس باب میں انھوں نے چند اہم مستند تحریروں کی تفصیل پیش کی ہیں، جن میں کیا خوب آدمی تھا، کاتا باقی، خطوط، ادب یا تب، ریڈیو کی کہانی، نشریات ماجد، تنقیدی اشارے وغیرہ شامل ہیں۔ ان تحریروں کے سلسلے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیا خوب آدمی تھا مختلف شخصیات پر مختلف قلمکاروں کی تحریریں ہیں جبکہ کاتا باقی خواجہ حسن نظامی، خطوط رشید احمد صدیقی، ادب یا تب فراق گورکھپوری، ریڈیو کی کہانی پروفیسر مجیب، نشریات ماجد مولانا عبدالماجد دریابادی، تنقیدی اشارے آل احمد سرور کی ریڈیو سے نشر ہونے والی ریڈیائی تقاریر کی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ ان عنوانات کے تحت متعدد موضوعات پر متعدد تحریریں نشر ہوچکی ہیں جن پر کتاب میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ریڈیو سے نشر ہونے والے شامل کتاب ہے۔ مختلف شخصیات کی تحریروں اور مضامین کی طویل ترین فہرست بھی شامل کی گئی ہے۔ اسی باب میں ریڈیو ڈرامے پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یونان اور مصر میں ڈرامے کی روایت سے قطع نظر ہندوستان میں بھی ڈرامے کی قدیم روایت موجود رہی ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہندوستان میں تھیٹر کے زوال کے ساتھ ہی اردو ڈرامے کا بھی زوال شروع ہو گیا۔ ڈرامے کے ضمن میں اردو کے شہرۂ آفاق ڈراما نگاروں کی بھی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ مشاعروں کی مقبولیت سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے۔ ریڈیو پر بھی مشاعرے ہوتے رہتے ہیں اور اب بھی ہو رہے ہیں۔ لہٰذا شاہین اختر نے ریڈیائی مشاعروں کی بھی جھلک دکھائی ہے۔

نشریاتی ادب کے اسلوب کے تحت ریڈیو سے نشر ہونے والے متعدد پروگراموں کی روشنی میں جائزہ لیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ریڈیائی تحریروں میں بے تکلفی، سادگی، فطری انداز، درست لفظوں کا استعمال وغیرہ کا لحاظ رکھا جانا چاہیے۔ ان اصولوں کی روشنی میں کئی نشر پاروں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ آخر میں مختلف نشریاتی اصناف جیسے ناٹک، ڈراما فیچر، مباحثہ، خبریں، دستاویزی پروگرام اور انٹرویو کے سلسلے میں گفتگو کی گئی ہے۔

بچوں کی صحافت کے سو سال

(ضیاء اللہ کھوکھر)

اس سے قبل ضیاء اللہ کھوکھر کی مرتب کردہ کتاب ”فہارس الاسفار“ کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اب ان کی ایک اور مرتب کردہ کتاب ”بچوں کی صحافت کے سو سال“ کے مطالعہ کا شرف حاصل ہوا۔ یہ دونوں کتابیں اپنے موضوع اور مواد کے اعتبار سے انتہائی مفید معلوماتی اور نادر ہیں۔ اول الذکر کتاب میں تو مخطوطات کی فہرستیں تھیں و ثانی الذکر میں اطفال کی صحافت کے سو سال کا احاطہ کیا گیا ہے اور شاید یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ اگرچہ یہ بہت ضخیم نہیں ہے مگر یہ ضخیم اور بڑی کتابوں پہ بھاری ہے۔

ضیاء اللہ کھوکھر صاحب شہرت و نام و نمود سے بے نیاز ہو کر کام کرتے رہتے ہیں۔ انھوں نے پاکستان کے شہر گوجرانوالہ میں اپنے والد کے نام سے [illegible] جو [illegible] اس کی بھی مثال [illegible] ملتی ہے۔ انفرادی طور پر ایسی کوششیں بہت کم نظر آتی ہیں۔ ضیاء اللہ کھوکھر کتابوں پر بے تحاشا خرچ کرتے ہیں اور اسے دولت کا زیاں نہیں سمجھتے۔ ظاہر ہے علم کی دولت سے بڑی کوئی دولت نہیں ہوتی اور کتابیں ہی اس کا بہترین ذریعہ ہوتی ہیں۔

ادب اطفال اور اطفال کی صحافت کو ہمارے ادیب وہ حق اہمیت نہیں سمجھتے۔ [illegible] بچوں کا ادب تخلیق کرنے والوں کو وہ مقام و مرتبہ نہیں ملتا جس کے وہ حقدار ہوتے ہیں۔ ادب اطفال کی تخلیق بھی اتنی ہی اہم ہے جتنی کہ سنجیدہ ادب کی تخلیق۔ بچوں کے معصوم ذہن میں جو چیز ڈال دی جاتی ہے اس کے اثرات تمام زندگی برقرار رہتے ہیں۔ لہٰذا بچوں کے لیے معیاری اور تعمیری ادب کی تخلیق [illegible] ضروری ہے۔ [illegible] منظر عام پر لائی گئی ہے۔ [illegible] میں

کتابیں تو ہوتی ہیں مگر اخبارات و رسائل نسبتاً کم ہوتے ہیں۔ چونکہ ان وسیلے سے رکھنا بھی ایک محنت طلب کام ہوتا ہے اس لیے لوگ اس جھنجھٹ میں نہیں پڑتے۔ محترم ضیاء اللہ کھوکھر نے بچوں کے رسائل و جرائد کو جمع کیا اور بچوں کی صحافت کے سو سال (1902 سے 2002 تک) کی تاریخ مرتب کردی۔ حالانکہ اس کتاب میں بچوں کے رسائل میں شائع ہونے والا مواد شامل نہیں کیا گیا ہے اس کی گنجائش بھی نہیں تھی۔ کیونکہ اس صورت میں کئی ضخیم جلدوں کی ضرورت تھی۔ لیکن بچوں کی صحافت کے آغاز سے لے کر 2002 تک شائع ہونے والے رسائل و جرائد کی فہرست اس کتاب میں موجود ہے۔ غیر منقسم ہندوستان اور 1947 کے بعد ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہونے والے رسائل و جرائد کی فہرست پیش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ خود ضیاء اللہ کھوکھر نے تعارف کے عنوان سے اتنا وقیع اور معلوماتی مضمون سپرد قلم کیا ہے کہ اس میں بچوں کی صحافت کی تاریخ سمو دی گئی ہے۔ اس مضمون کے مطابق بچوں کی اردو صحافت کا آغاز 1902 میں ہوا۔ فہرست اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ پہلے رسالے یا اخبار کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے نیچے ایڈیٹر کا نام اور سامنے مقام اشاعت اور سنہ آغاز اشاعت دیا گیا ہے۔ جن رسالوں کا صرف ایک ہی شمارہ دستیاب ہوا ہے ان کے بارے میں بتا دیا گیا ہے اور جس کے کئی شمارے شائع ہوئے ان کو بھی درج کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان رسائل و جرائد کی بھی نشاندہی کردی گئی ہے جو اب بھی شائع ہو رہے ہیں۔ بعض رسائل کا سنہ اشاعت معلوم نہیں ہو سکا ہے اسے بھی واضح کر دیا گیا ہے۔ اسی طرح چند ایک کے مقام اشاعت کا پتہ نہیں چل سکا تو اسے بھی بتا دیا گیا ہے۔ رسائل و جرائد کی فہرست سنہ اشاعت کے اعتبار سے نہیں بنائی گئی ہے۔ بلکہ حروف تہجی کے اعتبار سے فہرست سازی کی گئی ہے۔ میں نے اس فہرست سے جو رسائل شماری کی تو پتہ چلا کہ 1902 سے لے کر 1941 تک غیر منقسم ہندوستان میں 19 رسائل و جرائد شائع ہوئے اور 1941 سے لے کر اب تک 10 رسائل و جرائد شائع ہوئے ہیں یا ہو رہے ہیں۔ کتاب میں بچوں کے ان رسائل کی بھی فہرست دی گئی ہے جن کے اجرا کی تاریخ معلوم نہیں ہو سکی ہے۔ ان کی کل تعداد 19 ہے اور ان رسائل کی تعداد جو بچوں کے تو نہیں ہیں مگر ان میں بچوں کا مواد شائع ہوتا رہتا ہے یا ہو رہا ہے 70 ہے۔ فہرست کی ترتیب میں ان رسائل و جرائد کو سامنے رکھا گیا ہے جو عبدالمجید کھوکھر

لائبریری میں موجود ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہندوستان سے شائع ہونے والے کئی اور رسائل و جرائد کے نام اس میں نہیں ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا بچوں کی صحافت کا آغاز 1902ء میں ہوا ہے اور جس رسالہ سے آغاز ہوا اس کا نام تھا ''بچوں کا اخبار''۔ اسے اردو زبان کا پہلا ماہنامہ رسالہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ اسے لاہور سے مولوی محبوب عالم نے جاری کیا اور دس سال تک نکلنے کے بعد یہ اخبار بند ہو گیا۔ اس کے بعد جس اخبار کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی اس کا نام تھا ''پھول''۔ اسے 13 اکتوبر 1909ء کو مولوی ممتاز علی نے شروع کیا تھا۔ 48 برس سے زائد عرصہ تک جاری رہا اور اس نے اپنے معیاری مضامین سے نہ صرف بچوں بلکہ بڑوں کے بھی دل و دماغ کو معطر و معنبر بنائے رکھا۔ 1970 میں دوبارہ ''پھول'' کی اشاعت شروع کی گئی مگر وہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہ سکی۔ ''پھول'' کے بعد جس رسالے کی اہمیت ہے وہ دہلی سے شائع ہونے والا ''پیام تعلیم'' ہے۔ اس نے اپنا سفر 1926 میں شروع کیا اور اب بھی یہ جاری ہے۔ اس فہرست میں شامل رسائل و جرائد میں جو کافی مشہور ہوئے ان میں مذکورہ تینوں رسالوں کے علاوہ بال بندھو، کھلونا، غنچہ، شگوفہ، گلدستہ، طفلستان، نونہال، بچوں کا ساتھی، مسرت، نرالی دنیا، ہمدرد نونہال، نور، چندا، ہونہار قابل ذکر ہیں۔ اس کتاب میں بچوں کے جن معروف رسالوں کے نام نہیں ہیں ان میں کلیاں، اسکول ماسٹر، جگنو، بچوں کی دنیا، ہمارے وغیرہ بھی قابل ذکر ہیں۔

نیر مسعود نے فہرست سازی میں جو طریقہ اختیار کیا تھا وہی اس میں بھی اختیار کیا ہے۔ شروع میں دو تین مضامین دیے گئے ہیں اور اس کے بعد رسائل و جرائد کے ٹائٹل شائع کیے گئے ہیں۔ جو چھپنے کا طریقہ ہے، کتنی خوبصورت نظر آتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ رسائل و جرائد کے مدیروں نے بچوں کی نفسیات کا کتنا خیال رکھا اور ان کی سوچ کو سامنے رکھ کر ان کا ٹائٹل تیار کیا۔ قابل مبارکباد ہیں نیر مسعود جنھوں نے اتنا خوبصورت اور تاریخی کام کیا ہے۔

عہد عالمگیر کے درباری اخبار

(سید شاہ غازی الدین ایڈوکیٹ)

مغل حکمراں اورنگ زیب عالمگیر کے ساتھ ہندوستانی مورخوں اور مصنفوں نے جتنی ناانصافی کی ہے اتنی شاید کسی اور کے ساتھ نہیں کی ہوگی۔ ان کی اسلامی غیرت اور شریعت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی زندگی متعصب قلم کاروں کو ہمیشہ ناپسند رہی ہے۔ وہ ایک نہایت انصاف پرور بادشاہ رہے ہیں اور مسلمانوں کے ساتھ جیسا ان کا سلوک تھا ویسا ہی غیر مسلموں کے ساتھ بھی تھا۔ وہ سب کو اپنی رعایا سمجھتے تھے اور سب کے ساتھ مربیانہ برتاؤ کرتے تھے۔ لیکن ان کے دشمنوں کو ان کی یہ ادا پسند نہیں۔ اسی لیے وہ ان کی زندگی کے ان واقعات کو منظر عام پر لانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے جو انسانیت نوازی اور انصاف پسندی سے عبارت ہیں۔ اس کے برعکس ان کی شخصیت کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر ایک کٹر اور متعصب مسلمان تھا جس نے ہندوؤں کے ساتھ ظلم کیا۔ ایسے مورخوں اور مصنفوں نے ان تفصیلات کو سامنے نہیں آنے دیا جو ان کی زندگی کے روشن پہلوؤں کو نمایاں کرتی ہیں۔ تاہم ایسے متعصب مورخوں میں ڈاکٹر بی این پانڈے جیسے کئی مورخ بھی گزرے ہیں جنھوں نے اورنگ زیب کی انصاف پسندی اور رعایا پروری کو دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس حوالے سے ایک اہم نام سید شاہ غازی الدین ایڈوکیٹ کا بھی ہے جنھوں نے انتہائی عرق ریزی کے ساتھ عہد عالمگیر کے ان اخباروں کی منتخب خبروں کی روشنی میں ان کی اصل امیج کو دکھانے کی کوشش کی ہے جس کو بالقصد چھپایا جاتا رہا ہے۔

انھوں نے 2000ء میں "عہد عالمگیر کے درباری اخبار" کے نام سے ایک تحقیقی کتاب

تصنیف کی تھی جسے لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ اب انھوں نے اس کتاب میں مزید اضافہ کر
کے اس کا نیا ایڈیشن شائع کیا ہے۔ پہلے ایڈیشن میں انھوں نے 1685 سے 1707 تک کے
اخباروں کے حوالے دیے ہیں۔ اب دوسرے ایڈیشن میں انھوں نے اس سے پہلے کے اخباروں
کے متعلقات بھی شامل کیا ہے۔ اس طرح اب اس کتاب میں 1666 سے لے کر 1707 تک
کے اخباروں کا جائزہ ہے۔ چونکہ اس وقت باضابطہ اخبار شائع نہیں ہوتے تھے البتہ سیاسی،
عسکری، تہذیبی اور ثقافتی امور کو ضبط تحریر میں لانے کا رواج تھا۔ اس کے لیے سرکاری طور پر وقائع
نویس مقرر تھے۔ واقعات و حقائق ضبط تحریر میں لانے کے بعد سرکاری سطح پر ان کی تصدیق کی
جاتی اور پھر وہ متعلقہ ذمہ داروں سے پاس ہو کر آگے جاتے۔ یہی وہ اخبار کہا جاتا رہا
ہے۔ مصنف کو 1666 سے 1685 تک کے اخبارات بھی حاصل ہو گئے جنھیں پونے کے بھارت
اتہاس سنشودھک منڈل کے ادارہ نے فارسی سے مراٹھی میں ترجمہ کر کے شائع کیا ہے۔ اس
ادارے سے وابستہ پروفیسر [illegible] اور [illegible] نے اس سلسلے میں قابل ذکر خدمات
انجام دی ہیں۔ کتاب ہذا کے مصنف نے مراٹھی میں سے چند اخبارات کا فارسی سے اردو میں ترجمہ
کیا ہے اور اس کی بنیاد پر اس کتاب میں اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب میں سابقہ کتاب کو دوسرا حصہ
کے طور پر اور نئے اضافے کو پہلے حصے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

اس کتاب سے ملنے والی بہت سی شہادتیں ایسی ہیں جن کی روشنی میں شہنشاہ اورنگ زیب
عالمگیر کی ایک بہت ہی روشن شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ اورنگ زیب نے شیواجی کے بیٹے
سنبھاجی کو اس کی سازشوں، بغاوت گری اور شہزادہ اکبر کے ساتھ مل کر بغاوت اور مغل حکومت سے اس کی
جنگی اور غداری کی بنا پر ہی اس کا برسرعام قتل کروا دیا تھا۔ بقول علامہ شبلی نعمانی اورنگ زیب
کی زندگی کا یہ واحد واقعہ ہے جس میں انھوں نے انتہائی سخت سلوک کیا۔ اس کے بعد راجہ شیواجی
کے افراد خاندان کو گرفتار کیا گیا جن میں مقتول سنبھاجی کی بیوہ یسو بائی بھی تھی اور اس کا کمسن لڑکا
شاہو بھی تھا، گرفتار کر کے بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ بادشاہ نے ان تمام کے ساتھ انتہائی
رحم دلی اور عزت و احترام کا سلوک کیا۔ ان کو بہادر گڑھ کے قلعہ میں رکھا۔ قلعہ کے ایک محافظ نے
ان میں سے ایک خاتون پر غلط نگاہ ڈالی تو بادشاہ نے اسے گرفتار کر لیا ورنہ تمام خواتین کو الگ خیمے

میں رکھا۔ مقتول سنبھاجی کے کمسن بیٹے کو راجہ کا خطاب دیا اور جب وہ بالغ ہوا تو مرہٹہ جاگیردار بہادر جی چودھری کی لڑکی سے اس کی شادی انتہائی دھوم دھام سے کی۔

اس وقت کے اخباروں میں بادشاہ کی مذہبی سرگرمیوں کا بھی خصوصیت کے ساتھ ذکر ہوتا تھا۔ ان خبروں میں نماز، روزے کا بالخصوص ذکر ہے۔ لیکن سب سے نمایاں تذکرہ تلاوت قرآن کی حیثیت کا ہوتا تھا۔ وہ فوجی مہمات کے دوران جہاں کہیں پڑاؤ کرتے وہاں سے پیدل فاصلہ پر تلاوت کے لیے مقامات کا تعین کرتے اور جب وہ قرآن کی تلاوت کی زیارت کے لیے جاتے تو نذرانے تقسیم کرتے۔ لیکن بقول مصنف تمام شریف کی تلاوت پر مشتمل ہوتے تھے اس کا تذکرہ نہیں نہیں ملتا۔ وہ کسی فوجی مہم پر روانہ ہوتے یا جب قلعہ روانہ ہوتا تو فتح کی دعا پڑھتے تھے۔ ان کی زبان سے ادعیہ کلمات ادا ہوتے۔ چھاؤنی میں تسبیح خانہ بھی ہوتا جہاں وہ عبادت کرتے۔ فوجی مہم کے دوران اگر محاصرہ یا کوئی بیت توقف ہی مسجد میں رمضان شریف میں اعتکاف بھی کرتے۔ اس وقت طرف میں کوئی چال رہی ہوتیں اور توپیں داغی جاتیں لیکن بادشاہ عبادت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ محرم کی دسویں تاریخ کو یتیم بچوں کو اپنی قیام گاہ میں بلاتے اور ان کے سروں پر دست شفقت پھیرنے کے بعد کچھ مٹھائیاں، کچھ رقم اور کبھی سونا چاندی دے کر رخصت کرتے۔ اس کتاب میں اورنگ زیب کی ازدواجی زندگی اور اس سے قبل ان کے معاشقوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے آخری ایام کیسے گزارے اس پر بھی کافی روشنی پڑتی ہے۔

اخباروں کے مطالعے سے شہنشاہ کی شخصیت ایک صاف ستھرے اور محنت کش انسان کی ابھرتی ہے۔ وہ اپنی عمر کے آخری دور میں بھی جبکہ ۹۰ سال کے ہو گئے تھے مسلسل محنت سے کام لیتے تھے۔ اس عمر میں بھی پالکی اور گھوڑوں پر سوار ہو کر کوہستانی اور جنگلی علاقوں میں روزانہ آٹھ آٹھ دس دس میل کا سفر کرتے۔ یہ اسفار تفریحی نہیں ہوتے بلکہ وہ جنگی مہمات کا حصہ ہوتے۔ جنگلوں اور پہاڑوں پر خیمہ نصب ہوتے اور دور دراز ملک کے حالات سے باخبر رہتے۔ خبر گیری کا ایسا پختہ انتظام تھا کہ ایک موقع پر دہلی میں کسی شخص نے اپنے مکان میں غیر قانونی شراب کشید کی اور اس کی اطلاع دکن کے کسی جنگل میں نصب خیمے میں بادشاہ کو ہو جاتی ہے۔ وہ تمام دن اپنے خیمے میں بیٹھ کر دیوانی اور فوجی عدالتیں لگاتے اور مقدمات کا فیصلہ کرتے۔ وہ ایک خدا ترس

بادشاہ تھے۔ گفتگو میں انتہائی محتاط رہتے۔ موسیقی سے کوسوں دور اور جشن و طرب کے سخت مخالف۔ چہرے پر ہمیشہ سنجیدگی رہتی۔ کسی نے انھیں قہقہہ لگاتے نہیں دیکھا۔ بڑے سے بڑے المناک واقعہ پر بھی غمگین نہیں ہوتے۔ کسی سانحہ پر کہتے "اللہ کی مرضی کے خلاف کوئی مدد نہیں"۔ اگر بہت زیادہ خوش ہیں تو واہ واہ اور آفریں کے علاوہ دوسرا کلمہ ادا نہیں کرتے۔

اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ فروری 1707 میں ان کی طبیعت دوبارہ بگڑ جاتی ہے۔ اس کے باوجود وہ دربار میں پہنچ کر انتظامی امور میں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن انھیں احساس ہو جاتا ہے کہ وقت آخر قریب آ گیا ہے۔ وہ اس وقت احمد نگر میں خیمہ زن ہیں۔ چھاؤنی اور وہاں موجود افراد کا تحفظ بھی پیش نظر ہے۔ شہزادہ کام بخش اور محمد اعظم کے مابین ٹکراؤ کا اندیشہ بھی نظر آ رہا ہے۔ انھوں نے 10 فروری کو کام بخش کو بیجاپور کی صوبہ داری پر روانہ کر دیا اور اعظم کو 13 فروری کو مالوہ کی صوبہ داری پر روانہ کیا۔ اعظم بہت متعصب تھا۔ اسے احساس ہو گیا کہ بادشاہ چند دن کے مہمان ہیں۔ حکم کے باوجود انتہائی سست رفتاری سے مالوہ کی جانب روانہ ہوا تا کہ وقت پڑنے پر فوری طور پر احمد نگر کی جانب روانہ ہو جائے۔ چار دن کے بعد بادشاہ کو تیز بخار آ گیا۔ اس کے باوجود انھوں نے دربار میں حاضر رہنے پر اصرار کیا۔ اس کیفیت میں وہ پانچوں وقت کی نماز باجماعت بھی ادا کرتے رہے۔ دونوں بیٹوں کو خطوط لکھ کر تسلی دی اور بھائی چارے کی نصیحت بھی کی۔ 20 فروری 1707 بروز جمعہ فجر کی نماز پڑھی تسبیح ہاتھ میں لی۔ زبان پر کلمہ طیبہ کا ورد جاری تھا۔ آٹھ بجے صبح سانس میں تکلیف ہوئی۔ اس عالم میں بھی کلمہ پڑھتے رہے اور اسی عالم میں ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ 22 فروری کو شہزادہ اعظم چھاؤنی میں داخل ہوا۔ بہن زینت النسا کو صبر کی تلقین کی اور وصیت کے مطابق دولت آباد کے قریب ایک بزرگ حضرت شیخ زین الدین کے مزار کے قریب انھیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

26 مارچ 1685 کے اخبارات سے پتہ چلتا ہے کہ اورنگ زیب کی وسیع القلبی اور مذہبی رواداری کی مثال بہادر گڑھ کا قلعہ بھی ہے جو احمد نگر ضلع کے تعلقہ سری گوندہ سے چار پانچ کلومیٹر دور بھیما ندی پر واقع ہے۔ مغلوں نے بھیما ندی کے کنارے موضع پیڈگاؤں میں ساحل دریا پر ایک ایسے گاؤں کا انتخاب کیا جہاں سال بھر خوب پانی رہتا تھا اور جو دو تین لاکھ فوجیوں اور ان کے

متعلقین کے لیے کافی ہوتا۔ مگر قلعہ کی تعمیر کے وقت وہاں سیاہ رنگ کے پتھر کے 110 مندر بہت اچھی حالت میں تھے۔ لیکن یہ مندر تعمیر کردہ قلعہ میں آ گئے۔ اس قلعہ میں کئی سالوں تک مغل سردار، شاہی خاندان کے افراد اور خود اورنگ زیب کا قیام رہا۔ اس کے باوجود تمام یہ مندر جوں کے توں قائم رکھے گئے۔ (وہ تمام مندر آج بھی قائم ہیں البتہ چونے اور اینٹ سے بنی مسجد مرمت نہ ہونے کی وجہ سے شہید ہو گئی ہے)۔

اس وقت وقائع نویس کس قسم کی خبریں مرتب کرتے تھے اس کے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں

10 دسمبر 1699 کل شام بادشاہ کو اطلاع دی گئی کہ بدمعاش دشمن کے دستے بادشاہی چھاؤنی سے صرف تین کوس قریب آ گئے ہیں۔ انھوں نے بنجاروں پر حملہ کر کے ان کے مویشی لوٹ لیے۔ یہ سن کر بادشاہ نے دشمن کے خلاف تادیبی کارروائی کے لیے بخشی الملک بہرہ مند خاں اور مطلب خان وغیرہ کو مقرر کیا۔ یہ لوگ دشمن کا پیچھا کرنے فوراً روانہ ہوگئے۔

23 جنوری 1701 آج صبح ہرکاروں کی زبانی معلوم ہوا کہ بادشاہی چھاؤنی سے آٹھ کوس کے فاصلہ پر موضع [illegible] ایک مقام ہے۔ چوروں (مراٹھوں) کے سردار دھنا جی جادھو نے اپنی فوج کا ایک حصہ ولبھ پور کی سمت روانہ کیا ہے اور دوسرا حصہ جو چھ ہزار سواروں پر مشتمل ہے بادشاہی چھاؤنی کے اطراف چکر لگا رہا ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ حمید الدین خاں فوج کے ساتھ تیار رہے۔ اسی دوران ہرکاروں سے موصول خبروں کی بنیاد پر حمید الدین خاں نے بادشاہ کو بتایا کہ بدمعاش دشمن کی فوج چھاؤنی سے تین کوس کے فاصلہ تک آ گئی ہے۔ اسی دوران بادشاہ کو معلوم کرایا گیا کہ غدار (مراٹھوں) کی فوج بھی کثیر تعداد میں ہے۔

یکم جنوری 1703 بادشاہ کا قیام کونڈانا قلعہ کے زیریں حصہ میں ہے۔ آج کچہری کا کام نہیں ہوا۔ کل روح اللہ خاں نے درخواست پیش کی تھی کہ آپ کے حکم کے مطابق حمید الدین خاں بہادر، محمد امین بہادر، عزیز خاں اور مطلب خاں کونڈانا قلعہ کے اطراف گشت لگا کر آئے ہیں۔ ہم نے معائنہ کیا۔ قلعہ کے اطراف تھانے قائم کیے گئے ہیں اور آس پاس کی جھاڑیوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔

28 جنوری 1703 مالوہ کی خبروں سے حقیقت معلوم ہوئی کہ محمد حکیم نے جزیہ وصول

راستے میں ایک تھانہ (ایک چھوٹا قلعہ یا گڑھی) مقرر کیا تھا۔ برہم دیو سسودیا کے نائب دیوی سنگھ کی زمینداری کے علاقے میں محمد حکیم نے جلال محمد کی سواری روانہ کیا تھا۔ وہاں کسی نے جلال محمد کی داڑھی اور مونچھ مونڈھ کر رسوا کر دیا۔ بادشاہ نے دیوی سنگھ کے منصب میں کمی کر دی۔

مارچ 1703 – وزیر علی کا بھتیجا جو مسلمان ہوا اسے خلعت دی گئی۔ پانچ مرہٹے ملازمت کی غرض سے محمد امین خاں بہادر کے پاس آئے۔ انھیں بادشاہ کے حضور میں لایا گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انھیں خلعت دی جائے۔

22 نومبر 1704 – بادشاہ بہادر گڑھ کے قریب قیام کرتے ہیں۔ دیوان عام بند تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ امیر الامرا اسد خاں (وزیر اعظم) کو حکم دیا گیا کہ نواب زینت النساء بیگم اور دوسری پردہ دار بیگمات وغیرہ بہادر گڑھ آ رہی ہیں۔ بادشاہ زادہ کام بخش، حمید الدین خاں بہادر، محرم خان وغیرہ استقبال کے لیے جائیں اور بیگم صاحبہ کے ساتھ آئیں۔ حکم کے مطابق تمام لوگ گئے۔ واپسی کے وقت انھوں نے بیگم صاحبہ کو مجرا کیا۔ تمام نذر پیش کیے۔ امیر الامرا کو بیگم صاحبہ نے جواہر سے سرفراز کیا۔ پان کا بیڑا مرحمت کیا۔ حمید الدین خاں بہادر کو پانچ مہریں انعام اور پان کا بیڑا دیا۔

11 جنوری 1705 – آج عید غدیر تھی۔ دیوان کا کام بند رکھا گیا۔ آج امیر الامرا اسد خاں عید کی مبارکباد دینے دربار میں آئے ہیں۔ اس کی اطلاع بادشاہ کو دی گئی۔ بادشاہ نے کہا کہ وہ اپنے خیمے میں واپس جائیں۔ انھوں نے درخواست روانہ کی کہ اگر اجازت ہو تو شہزادہ کام بخش اور زینت النساء بیگم کی ڈیوڑھی پر سلام کرنے جاؤں گا۔

غرض اس کتاب میں بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور ایسے واقعات سامنے لائے گئے ہیں جو ابھی تک مخفی تھے۔ سید شاہ غازی الدین ایڈووکیٹ اس کتاب کی تصنیف پر مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اورنگ زیب عالمگیر کی زندگی اور ان کی مہمات سے متعلق یہ ایک قابل قدر تصنیف ہے۔ یقیناً اس کی پذیرائی ہونی چاہیے۔

باب چہارم:

ہمعصر الیکٹرانک میڈیا کی ایک جھلک

میڈیا اور معاشرہ کا باہمی رشتہ

[illegible]

[illegible]

میڈیا کیسا ہونا چاہیے

[illegible] میڈیا کیسا ہونا چاہیے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جیسا

[illegible]

…ہو جاتا ہے۔

میڈیا … جب کہیں فسادات ہوتے ہیں تو … [illegible]

… رپورٹنگ سے حالات کو مزید ابتر بنایا جاتا ہے۔ دہشت گردی کا کوئی واقعہ اگر کہیں ہو گیا ہے تو اس کی … پیش کیا جاتا ہے اور … ثبوت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ میڈیا کی … رپورٹنگ سے ایک خاص فرقے کے خلاف ماحول سازی ہوتی ہے اور … میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ فسادات کے دوران تحقیقی … رپورٹنگ بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ایسے مواقع پر نامہ نگار اور رپورٹر ایک خاص ذہنیت کے تحت کام کرنے لگتے ہیں جو انتہائی خطرناک ہوتی ہے اور اس کے نتائج بھی بہت بھیانک ہوتے ہیں۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ذمہ دار کون؟

[illegible] ذمہ دار قرار دے سکتے ہیں؟ شاید مکمل طور پر نہیں۔ [illegible]

[illegible] کی [illegible] حوصلہ افزائی [illegible]
[illegible] جو بھی [illegible]
[illegible] ہوتی ہے۔

[illegible] بہت بڑی خدمت ہوگی اور

جہاں میڈیا کو ان کا ہیں سے ہے ... مظہر ہوتے ہیں ... روایت ... ذرائع سے
معیار بنا ... وقت پوری دنیا ... ان ... اور ... پڑتا
ہے ... ان حالات میں میڈیا اور اس کے اداروں پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔
انھیں اپنی اس ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے تاکہ مستقبل کا مورخ انھیں ... کا ذکر ...
قرار دینے کے بجائے انسانیت کے تئیں ان کی خدمات کو سراہے اور اس کے لیے انھیں خراج
عقیدت پیش کرے۔

میڈیا اور سماجی سروکار

[illegible]

[illegible]

[illegible] کی تحریک اور ان تمام امور کا جن کا ذکر

[illegible] کہ میڈیا ایک ہی رخ میں اپنے گھوڑے دوڑاتا رہتا

[illegible] سمت میں بھاگ لیتا ہے۔

سوشل میڈیا کا [illegible]

[illegible]

موقف کی تائید میں عدالت [illegible]

[illegible]

[illegible] یا ہو جیسی سائٹوں پر قابل [illegible] رنے میں شدت آگئی ہے۔ [illegible] نے کی پوری آزادی ہے اس لیے ان کا استعمال [illegible] [illegible] ایک [illegible] نہیں ہوا [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] لی اور یہ ایمرجنسی جیسی بات ہوگی۔ حکومت [illegible]

[illegible]

[illegible] سائٹ فیس بک کا کہنا ہے کہ ہم یہ تو [illegible] کا اظہار کریں لیکن دوسروں کے جذبات کا [illegible] کے ذمہ داران حکومت کے رابطے میں ہیں۔ یاد رہے کہ [illegible] مواد قابل اعتراض ہے اور کون سا نہیں ہے اس بارے میں حکومت ہند [illegible]

[illegible] مہذب دکاندار دوسروں [illegible]

[illegible] ملکوں میں جو ووٹ کی انتخاب [illegible] نتیجے میں جس [illegible] چاہیے۔ اس سوشل پلیٹ فارم کا استعمال کرنے [illegible]

2010 اور میڈیا

سال 2010 [illegible] کی معلومات اٹھے۔ جس میں کا [illegible] ان [illegible] انھیں میڈیا نے ہی سب غائب کیا تھا۔ [illegible]

[illegible] وبیشتر ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کسی چینل نے [illegible] کبھار تو انتہائی عجیب [illegible] کے [illegible] ایسے جانے کتنے واقعات کو بہت زیادہ اہمیت [illegible] میڈیا کو نظر

[illegible]

[illegible] سے عوامل کام کر رہے تھے اس کے بارے میں عام [illegible]

[illegible] Canary Trap [illegible]

[illegible] چینل [illegible]

[illegible] نہیں

چاہیے۔ Canary Trap [illegible] انکشاف کرتا ہے کہ گزشتہ سال نومبر میں

[illegible] کے ساتھ ایک میٹنگ کی تھی اور

[illegible]

[illegible] چینلوں [illegible] کے ساتھ ہی

[illegible] انگریزی اخبار اور ایک بڑے انگریزی چینل

[illegible] چینل، نیشنل [illegible]

[illegible] آف انڈیا [illegible] 1900 [illegible] 12 کروڑ روپے کا تھا۔ اس

[illegible] خط کی نقل بھی شائع کی ہے جو [illegible] آف انڈیا [illegible]

اخبار نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ [illegible]

ہموار کرنے کے لیے مختلف قسم کے پروگرام چلائے [illegible] سے متعلق

[illegible]

[illegible] اور انھوں نے

[illegible] کروڑ روپے [illegible] چینل سے

[illegible] چینل کے ساتھ [illegible] معاہدے کیے۔ اس

کے بعد [illegible] سوال کرتا ہے کہ

[illegible] طویل وقفے تک خاموشی [illegible]

[illegible] Canary Trap [illegible] امید نہیں [illegible]

[illegible] سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ میڈیا کی مہم نے بہت کام کیا اور کھیلوں کی

تبدیلیوں میں کافی حد تک کمی [illegible] معیار کے [illegible] لیے گئے۔ اس کے ساتھ ہی میڈیا کے [illegible] بدعنوانیوں کی بڑے پیمانے پر جانچ بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح [illegible] میں ہونے والی بدعنوانیوں کے انکشاف میں بھی میڈیا نے [illegible] نہیں [illegible] سیاست [illegible] کا انکشاف میڈیا نے [illegible] میڈیا [illegible] نیک نامی میں شمار ہوں گے۔

بڑے صحافیوں کی لابنگ

لیکن اس معاملے کے ساتھ ایک اور معاملہ سامنے آیا جو اس کی ساکھ کو مسخ کرنے کے لیے کافی تھا۔ [illegible] رپورٹ [illegible] کے ساتھ چند بڑے صحافیوں کی بات چیت [illegible] سیاست دان [illegible] سیاست کے ساتھ ساتھ [illegible] صحافیوں [illegible] نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب بھی [illegible] اخلاقیات کی بات ہو جاتی ہے اور ضابطوں کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ساری باتیں بھلا دی جاتی ہیں۔ طرفہ تماشا یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے معاملات میں ملوث ہوتے ہیں وہ [illegible] اس قسم کے معاملات میں دوسرے ملوث ہوتے ہیں تو ان کو [illegible] ساتھ ہی اس قسم کے لوگوں کا رابطہ [illegible] صحافیوں سے [illegible] اثرات کا استعمال کر کے اپنا مقصد حاصل کرتے ہیں۔ صحافت میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اس مقدس پیشے کی قیمت وصول کرتے ہیں اور اس کو اپنے ذاتی اور گروہی مفادات کے حصول میں استعمال کرتے ہیں۔ جس طرح بہت سے سیاست دان سیاست کے میدان میں آتے ہی [illegible] کے انبار لگا دیتے ہیں اسی طرح بہت سے صحافی بھی اپنے قلم کی حرمت کا سودا کر کے [illegible] کے مالک بن جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس ذہنیت کی

[illegible]

[illegible] کے ساتھ یہ بھی سچ ہے کہ میڈیا نے بہت سی
بدعنوانیوں کو بے نقاب کیا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ چند لوگوں کی کرتوتوں کی بنیاد پر پورے میڈیا کو

تنقید کا نشانہ نہیں بنایا جانا چاہیے۔ لیکن بہر حال میڈیا کے لیے ایک ایسے ضابطۂ اخلاق کی ضرورت ہے جو صحافیوں کو ان کی غلط کاریوں سے روک سکے تاکہ صحافت کے اعلیٰ اصولوں کی پامالی نہ ہونے پائے۔ اس کے لیے دیانتدار صحافیوں کو آگے آنا ہوگا تاکہ میڈیا میں جو گھٹیا سوچ پیدا ہوتی جا رہی ہے اس سے اسے نجات دلائی جا سکے۔

مسلم ایشوز اور میڈیا

مسلم ایشوز اور میڈیا کے حوالے سے جب بھی بات ہوتی ہے تو یہ رائے ضرور سامنے آتی ہے کہ میڈیا جانبدار ہے اور تعصب کا شکار ہے۔ وہ مسلم معاملات کو ایک خاص عینک لگا کر دیکھتا اور ایک مخصوص رنگ میں پیش کرتا ہے اور مسلمانوں کی ایک شبیہ بنانے کی کوشش کرتا ہے جو اسٹیریو ٹائپ ہو اور جو برادرانِ وطن سے مختلف ہو۔ یہ شکوہ صرف مسلمانوں کا نہیں ہے بلکہ غیر جانبدار غیر مسلم صحافیوں اور دانشوروں کا بھی ہے۔ اس بات کو تحقیق کی کسوٹی پر بار بار پرکھا گیا ہے اور میڈیا کبھی بھی اس کسوٹی پر خالص اور کھرا نہیں اترا ہے۔ وہ مسلمانوں کے ان معاملات کو عموماً اپنے دائرہ قلم سے خارج تصور کرتا ہے جو ملک و قوم کی تعمیر سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کے کیمرے کا فوکس ان سرگرمیوں کا احاطہ نہیں کرتا جو مسلمانوں کی مثبت تصویر پیش کریں۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ یہ صرف ہندوستانی میڈیا کا رویہ نہیں ہے بلکہ یہ صورت حال عالمی سطح پر ہے۔ بین الاقوامی میڈیا بھی امتیازات کا شکار ہے اور تعصبات کے تنگ دائروں میں قید ہے۔ آپ آج کے واقعات کا بغور جائزہ لیں یا دس سال پیچھے جھانک کر دیکھیں، کم و بیش ایک جیسی صورت نظر آئے گی۔

نائن الیون کے بعد میڈیا کی مرغوب غذا دہشت گردی بن گئی ہے۔ ہندوستان میں 26/11 کے واقعے نے اس ذوق کو مزید جلا بخشی ہے۔ نائن الیون کے بعد جہاں مسلمانوں کو عالمی سطح پر تختۂ مشق بنایا گیا وہیں ممبئی حملوں کے بعد ہندوستانی مسلمان نازک حالات سے گزر رہے ہیں۔ میڈیا خبریں دکھانے میں کس طرح من پسند ایشوز کا انتخاب کرتا ہے اس کی ایک مثال بنگلور کے ڈاکٹر محمد حنیف کی ہے۔ جب انھیں 2007 میں دہشت گردی کے ایک جھوٹے معاملے میں آسٹریلیا کے برسبین سے گرفتار کیا گیا تھا تو ہندوستان کے میڈیا نے اس کا خوب پروپیگنڈا کیا تھا۔ پرنٹ

اور ایسے میں کئی روز تک دونوں میڈیا میں محمد حنیف کے حوالے سے ہندوستانی مسلمانوں کے چہرے دہشت گردی کی کالک سے سیاہ کر دیے گئے تھے۔ اس واقعے کی آڑ میں عالمی دہشت گردی کا محاسبہ اور محاصرہ کیا گیا تھا اور مسلمانوں کی صورت ایک مخصوص برش سے پینٹ کر دی گئی تھی۔ دراصل جولائی 2007 میں برطانیہ میں ایک ناکام دہشت گردانہ حملے میں گرفتار شدگان میں سے ایک شخص کے پاس سے ایک موبائل سم کارڈ برآمد ہوا تھا جس کے بارے میں پولیس کا دعویٰ تھا کہ وہ ڈاکٹر محمد حنیف کا ہے۔ محمد حنیف اس وقت آسٹریلیا کے ایک اسپتال میں بطور ڈاکٹر کام کر رہے تھے۔ اس مبینہ انکشاف کے بعد انھیں گرفتار کر لیا گیا اور بارہ دنوں تک تحویل میں رکھ کر ان پر زیادتیاں کی گئیں اور انھیں ایک خطرناک دہشت گرد بنا کر پیش کیا گیا۔ حالانکہ ڈاکٹر حنیف چیختے چلاتے رہے کہ وہ بے قصور ہیں اور ان کا کسی بھی دہشت گرد گروپ یا شخص سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن بارہ دنوں میں ان کے ساتھ [illegible] انسانی سلوک کیا گیا۔ اس پر پوری دنیا میں ہنگامہ ہوا اور وہاں کی حکومت نے ایک جانچ کمیٹی بنا دی۔ اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں ڈاکٹر حنیف کو بے قصور قرار دیا اور تب انھیں رہا کیا گیا۔ صرف اتنا ہی نہیں بعد میں وہاں کی حکومت نے باضابطہ طور پر ان سے معافی مانگی اور ایک خطیر رقم بطور معاوضہ پیش کی۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انھیں جس طرح ایک خطرناک دہشت گرد بنا کر ہندوستانی میڈیا نے پیش کیا تھا اس طرح ان کی معافی کے معاملے [illegible] میڈیا نے ایک [illegible] کے تحت اس خبر کا بائیکاٹ کیا [illegible] فریضہ [illegible] پر معافی اور [illegible] حکومت نے [illegible] سے معافی مانگی [illegible] میڈیا نے [illegible] اٹھایا ہوتا تو ایک طرف جہاں ان [illegible] دوسری طرف کسی مسلمان [illegible] اور سرکاری ایجنسیوں کو سوچنے پر مجبور ہونا پڑتا۔ لیکن میڈیا [illegible] مسلمانوں کو اپنے اوپر لگے داغ کو

صاف کرنے کا موقع جو مل جاتا۔

ہندوستان میں تو فرضی مقدمات میں مسلمانوں کو پھنسانے کے واقعات ایک نہیں درجنوں ہیں۔ لیکن نہ تو حکومت کوئی انکوائری کمیٹی بٹھاتی ہے اور نہ ہی بے قصور مسلمانوں کو پھنسانے کے خلاف کوئی کارروائی کرتی ہے۔ ایسے کئی واقعات سامنے آئے ہیں جب پولیس عدالتوں میں ملزموں کے خلاف کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکی اور عدالتوں نے ان بے قصور مسلمانوں کو رہا کر دیا۔ لیکن قومی میڈیا ان واقعات پر مہر بہ لب رہتا ہے۔ وہ ان ایشوز کو اٹھانے میں ذرا بھی دلچسپی نہیں لیتا۔ نہ ہی اس بات کو اٹھاتا ہے کہ جن بے قصور مسلمانوں کو عدالتوں نے رہا کر دیا ہے ان کو معاوضہ دیا جائے۔

پہلے فرقہ پرستی اب دہشت گردی

پہلے ہندوستانی مسلمانوں کا مسئلہ فرقہ وارانہ فسادات تھے اور اب دہشت گردانہ واقعات ہیں۔ نشانہ مسلمانوں کو ہی بنایا جاتا ہے بس انداز بدل گیا ہے۔ دہشت گردی کے حوالے سے بات آگے بڑھائی جائے تو بہت سی پرتیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ مالیگاؤں، مکہ مسجد حیدرآباد، اجمیر اور سمجھوتہ ایکسپریس جیسے بے شمار واقعات ہیں جو میڈیا کی [illegible] اور زیادتیوں کی کہانی بیان کرتے ہیں۔ ان دھماکوں کے واقعات میں مسلمانوں کو ہی گرفتار کیا گیا تھا۔ لیکن جب ممبئی اے ٹی ایس کے چیف ہیمنت کرکرے نے [illegible] کی تفتیش کا رخ [illegible] تو سارے چہرے [illegible] نظر آئے۔ جن جن واقعات میں مسلمانوں کو ملزم بنایا گیا تھا ان میں ہندو دہشت گردوں کی صورتیں نظر آنے لگیں۔ [illegible] تنظیموں نے ہندو دہشت گردی کو بے نقاب کرنے [illegible] چلا [illegible] کی موت پر [illegible] قدر [illegible] نہیں کی گئی جیسی کہ ضرورت تھی۔ [illegible] میڈیا [illegible] میں اس وقت زبردست [illegible] پیدا ہو جاتا ہے جب پولیس کی [illegible] سے [illegible] کی [illegible] ہے [illegible] مسلمانوں [illegible] ہے سے کئی نوجوان پھنسا دیئے گئے ہوں۔ ایسے معاملات پر یہ حضرات پولیس کی [illegible] کو ہی حتمی ثبوت مان لیتے ہیں اور ان کی بنیاد پر اور پھر بعد میں "ذرائع" کی بنیاد پر ایسی کہانیاں [illegible] جاتی ہیں

کر الامان والحفیظ۔ لیکن جب ممبئی اے ٹی ایس نے مالیگاؤں کیس میں چارج شیٹ داخل کی اور ''کچھ نئے دہشت گردوں'' کے چہروں کو بے نقاب کیا تو انھی پرجوش نمائندوں اور رپورٹروں کا جوش سرد پڑ گیا، انھوں نے اپنے ہونٹ سی لیے اور ایسی خاموشی اختیار کر لی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

قومی میڈیا کی اس جانبداری کی داستان بہت طویل ہے۔ اگر کسی مسلم علاقے یا کسی مسلم مذہبی مقام پر کوئی پٹاخہ بھی پھٹتا ہے تو ذرائع ابلاغ کے ایک حلقے کو ملک دشمنی اور دہشت گردی کی بو محسوس ہونے لگتی ہے لیکن جب کسی نام نہاد مندر یا آشرم میں کوئی دھماکہ ہوتا ہے تو یہی میڈیا اس کو معمولی واقعے کے طور پر پیش کر کے اس کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ میوات ایک انتہائی پرامن خطہ ہے جہاں مسلمانوں کی قابل لحاظ آبادی ہے۔ میوات ضلع کے نوح میں واقع ایک گوروکل مندر میں 22 ستمبر 2010 کو ایک دھماکہ ہوتا ہے۔ جس میں پولیس کو (Penta Erithrotol Tetra Nitrate) PETN کے ٹکڑے ملتے ہیں لیکن پولیس اس معاملے کو دبانے کی کوشش کرتی ہے۔ اخبارات اور نیوز چینل بھی اس سے چشم پوشی کرتے ہیں۔ لیکن یہ خبر رفتہ رفتہ چنڈی گڑھ اور دہلی پہنچ جاتی ہے اور پھر پولیس کو جانچ کرنی پڑتی ہے۔ اس مندر کی دیکھ ریکھ آنند شرما نامی ایک پجاری کرتا ہے۔ دھماکے کے بعد وہ فرار ہو گیا۔ اس مندر میں پچاس ساٹھ غیر مسلم نوجوان بھی رہتے ہیں۔ ذرائع کے مطابق مندر میں بارود رکھا ہوا تھا اور شرما نے گرو نے وہ بارود اس لیے اکٹھا کیا تھا کہ 30 ستمبر 2010 کو جب بابری مسجد کا فیصلہ سنایا جائے گا تو ممکن ہے کہ اس بارود کے استعمال کی ضرورت پڑے۔ خبروں کے مطابق شرما سمجھ رہا تھا کہ وہ بچ جائے گا۔ اس گروکل کا تعلق جھجر کی ایک تنظیم سے ہے جو فرید آباد میں بھی ایک گروکل چلاتی ہے۔ لیکن میڈیا میں یہ خبر کوئی خاص جگہ نہیں بنا سکی۔ انگریزی اخبار ملی گزٹ کی ایک رپورٹ کے مطابق حالیہ دنوں میں میوات میں فرقہ وارانہ صورت حال خراب کرنے کی کئی کوششیں کی گئیں۔ مقامی علاقے کے کئی مندروں میں مورتیوں کو نقصان پہنچایا گیا۔ 12 اکتوبر کو مہیش نامی ایک شخص نے پرجاپتی سیتارام نامی ایک شخص داڑھی لگا کر مسلمان کا بھیس بدل کے مندر میں مورتی کو نقصان پہنچایا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کے سر الزام ڈال کر ماحول کشیدہ پیدا کرنا تھا لیکن وہ شخص پکڑا گیا اور اسے پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ یہ خبر بھی اخباروں اور چینلوں پر نہیں آئی۔

کانپور ایک حساس شہر ہے۔ 28 اکتوبر 2010 کو وہاں کے ایک سرکاری ہیلتھ سینٹر میں دھماکہ ہوتا ہے جس میں چار افراد ہلاک اور آٹھ زخمی ہو جاتے ہیں۔ انگریزی اور ہندی کے اخباروں نے اسے پٹاخہ فیکٹری میں دھماکہ قرار دے کر اس کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کی۔ پولیس نے بھی اسے پٹاخے کا دھماکہ بتایا۔ لیکن ''انڈیا ٹوڈے'' نے بم دھماکہ بتا کر پولیس اور میڈیا کی پول کھول دی۔ اس کے بعد اخباروں کو اپنی ٹون بدلنی پڑی لیکن اس کے باوجود انھوں نے اس سے چشم پوشی کی اور عمداً اس خبر کو نظر انداز کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہیلتھ سینٹر کے کسی بھی ذمہ دار نے کوئی بیان نہیں دیا۔ انڈین مسلم آبزرور ڈاٹ کام کے عبدالرشید اگوان بتاتے ہیں کہ اس پرائمری ہیلتھ سینٹر کے کوارٹر میں جہاں یہ دھماکہ ہوا تھا، رہنے والے وارڈ بوائے راجیش نے انکشاف کیا ہے کہ اس کے برادران نسبتی سدھیر اور منگل سنگھ اس کوارٹر کو بم بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے اور انھیں جرائم پیشہ تنظیموں کو سپلائی کرتے تھے۔ راجیش کو 85 کارآمد بموں کے ساتھ پکڑا گیا۔ لیکن اخبارات نے اسے بھی کوئی اہمیت نہیں دی۔

بعض اوقات تو پولیس کی پریس بریفنگ کی بنیاد پر انتہائی خطرناک خبریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مثال جھارکھنڈ کی راجدھانی رانچی سے متعلق ایک خبر ہے۔ جس وقت آندھرا پردیش کے وزیر اعلیٰ کرن ریڈی نے مکہ مسجد بم دھماکہ میں مسلمانوں کو ملزم بنانے پر معافی مانگنے کا اعلان کیا اسی وقت رانچی کے اخبارات مسلم نوجوانوں کے خلاف ایک اسٹوری پکا رہے تھے۔ 15 دسمبر 2010 کو بیک وقت وہاں کے بیشتر ہندی اخبارات میں صفحۂ اول پر نمایاں انداز میں ایک خبر چھاپی گئی کہ ریاست کے مسلم نوجوانوں کا تعلق دہشت گرد گروپوں سے ہے۔ ''پربھات خبر'' نے اسے بینر بنایا اور لکھا کہ انڈین مجاہدین میں ''بریاتو'' کے مسلم نوجوان بھی ہیں۔ اسی طرح ''دینک جاگرن'' اور ''دینک بھاسکر'' نے بھی بریاتو کے مسلم نوجوانوں کا تعلق دہشت گرد تنظیموں سے جوڑ کر دکھانے کی کوشش کی۔ بریاتو پولیس تھانے کے ایس ایچ او کے ڈی سنگھ نے ایک ویب میگزین ''ٹو سرکلز ڈاٹ نیٹ'' کے رپورٹر مجتبیٰ عالم سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ''ایسی کوئی اطلاع پولیس کو نہیں ملی ہے۔ یہ جھوٹی خبر ہے اور یہ میڈیا کا بہت ہی افسوسناک اور غیر ذمہ دارانہ رویہ ہے''۔ اسی طرح ریاست کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس نیاز احمد نے بھی ''دینک ہندوستان''

سے بات چیت میں اس خبر کی تردید کی۔ دوسرے پولیس افسروں نے بھی کہا کہ ان کو ایسی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ جبکہ ایک ہندی رپورٹر نے کہا کہ اس نے یہ خبر پولیس بریفنگ کی روشنی میں لکھی ہے۔ خیال رہے کہ بریاتو رانچی کا ایک مسلم محلہ ہے اور اس بے بنیاد خبر کی اشاعت کے بعد مسلمانوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو گیا۔

کیچڑ میں کنول

تاہم قومی ذرائع ابلاغ سے متعلق تمام افراد کا رویہ ایسا نہیں ہے اور وہ پولیس کے بیان اور اس کی سچائی کی بنیاد پر خبریں شائع نہیں کرتے ہیں۔ جب تک کہ وہ حقائق کا پتہ نہ لگا لیں وہ کوئی خبر شائع نہیں کرتے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس قسم کے صحافیوں کو شر انگیز تنظیموں کی سازشوں کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اس کی بہترین مثال "تہلکہ" کی رپورٹر شاہینہ کی ہے۔ انھوں نے پی ڈی پی کے چیئرمین عبدالناصر مدنی سے متعلق معاملات کی تحقیق کرنے کی خاطر کرناٹک کے متعدد علاقوں کا دورہ کیا۔ مدنی کو 1998 میں کوئمبٹور بم دھماکے کے سلسلے میں گرفتار کیا گیا تھا۔ اس کے بعد نو سال تک انھیں انڈر ٹرائل قیدی کے طور پر جیل میں رکھا گیا۔ یکم اگست 2007 کو انھیں رہا کر دیا گیا اور تمام الزامات واپس لے لیے گئے۔ (بعد میں ایک دوسرے کیس میں پھر گرفتار کر لیا گیا)۔ تہلکہ کی شاہینہ نے چار دسمبر کے "تہلکہ" کے شمارے میں اس بارے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے۔ انھوں نے عبدالناصر مدنی پر عائد الزامات کی تحقیق کے لیے کرناٹک کے متعدد علاقوں کا دورہ کیا اور گواہوں اور عینی شاہدوں سے معلومات حاصل کیں۔ اس موقع پر شاہینہ کے خلاف ایک ماحول بنایا گیا اور پولیس نے ان پر گواہوں کو دھمکانے کا کیس درج کر دیا۔ بیشتر اخباروں نے بھی پولیس کی زبان بولی اور شاہینہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی۔ شاہینہ نے اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ جب وہ انٹرویو کرنے ایک گاؤں میں جا رہی تھیں تو پولیس والوں نے ان کے ڈرائیور سے سوال کیا کہ کیا وہ دہشت گرد ہیں" (یعنی پولیس کو کچھ علم نہیں وہ لوگوں سے پوچھ کر پتہ لگانے کی کوشش کرتی ہے کہ کون دہشت گرد ہے اور کون نہیں)۔ اس کے بعد تو "مشتبہ، پراسرار خاتون اور مدنی کی جاسوس" جیسے الفاظ سے انھیں دہشت گرد ثابت کرنے کی کوشش کی اور

لکھا کہ مسلمانوں کے ایک مشتبہ گروہ نے علاقے کا دورہ کیا ہے۔ شاہینہ کے علاوہ بھی قومی میڈیا میں ایسے کئی غیر جانبدار صحافی ہیں جو پولیس کے بیانات کے اردگرد تانے بانے نہیں بنتے بلکہ اپنی تحقیق اور انویسٹی گیشن کی بنیاد پر رپورٹنگ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ اکثریت میں نہیں ہیں تاہم ان کی تعداد خاصی ہے۔

2010 میں ممبئی حملہ کیس میں پاکستانی دہشت گرد اجمل عامر قصاب کے خلاف فیصلہ سنایا گیا۔ اس سلسلے میں امریکہ میں گرفتار ڈیوڈ ہیڈلی کا معاملہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ ہیڈلی نے ہندوستان کی این آئی اے (قومی تحقیقاتی ایجنسی) کے افسران کو پوچھ تاچھ کے دوران بتایا کہ گجرات پولیس کے ذریعہ ہلاک کی جانے والی ممبئی کی عشرت جہاں لشکر طیبہ کی ایجنٹ تھی۔ اس کے اس بیان پر ہندوستانی میڈیا نے آنکھ بند کرکے یقین کر لیا۔ جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خیال رہے کہ 15 جون 2004 کو تین نوجوانوں کے ساتھ عشرت جہاں کو ایک فرضی مڈبھیڑ میں مار دیا گیا تھا۔ اس انکاؤنٹر کی پول کھولی ہے ایک آزاد صحافی اور ڈاکومنٹری فلم ساز شبھرادیپ چکرورتی نے۔ انھوں نے ایک فلم بنائی ہے جس کا نام 'Encountered An Saffron Agenda' ہے۔ انھوں نے متعدد پولیس افسران سے گفتگو کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عشرت کا قتل ایجنسیوں کی غلطی کا نتیجہ ہے۔ ایس آئی ٹی نے بھی اپنی رپورٹ میں اس انکاؤنٹر کو فرضی بتایا ہے جس کی بنیاد پر کئی پولیس افسران کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی ہے۔

وکی لیکس کے انکشافات اور صحافتی اخلاقیات

انفارمیشن ٹیکنالوجی کے انقلاب کے اس دور میں کوئی بھی راز راز نہیں رہ گیا ہے۔ وہ خط و کتابت بھی جسے Confidential یا خفیہ کہا جاتا ہے اب خفیہ نہیں رہ گئی ہے۔ شاعر مشرق علامہ اقبال اور شاعر حریت اسد اللہ مرزا غالب نے اپنے متعدد اشعار میں یہ انکشاف کیا تھا کہ اب سب کچھ بے نقاب ہونے کا دور آ رہا ہے اور دنیا کا کوئی راز اب پردے میں نہیں رہ سکتا۔ اب سب کچھ طشت از بام ہو جائے گا اور جن طاقتوں نے طاقت سے مستقبل کی سمت ہولی اسی خود کو چھپانے کی باقی دیواریں اس بے نقابی اور راز افشائی کے طوفان میں خس و خاشاک کی مانند بہہ جائیں گی۔ "وکی لیکس" نے ان شاعروں کی پیشین گوئی کو حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔ اس کے انکشافات نے ایسی سنسنی پھیلا دی ہے کہ بہت سی شخصیات اور سیاست داں اور سفارت کار اور حکومتیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکی ہیں۔ اب یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس دور میں وہ زندہ رہے گا جسے اپنی رسوائی پر ندامت و شرمندگی نہ ہو یا پھر وہ زندہ رہے گا جو پردہ پوشی کے دوسرے ذرائع استعمال کرنے کے گر جانتا ہو۔ وکی لیکس کے Leaks یا افشائے راز نے خود ساختہ "بڑے عالم" کو بھی رسوا کر دیا ہے اور اسے چیف جسٹس جیسی اعلیٰ کرسی سے ہاتھ دھونے پر مجبور کر دیا ہے۔

وکی لیکس کی عمر ابھی بہت چھوٹی ہے۔ اس کی پیدائش 2007 میں ہوئی تھی۔ اس کم عمری میں اس نے شہرت و مقبولیت کی دوڑ میں بڑے بڑے سورماؤں کو پیچھے چھوڑ دیا ہے اور خود شہرت و مقبولیت کی چوٹی پر مسند نشین ہو گئی ہے۔ جب ایک نوجوان جولین اسانج نے اس ویب سائٹ کا قیام کیا تھا تو اسے بھی دوسری ویب سائٹوں کی مانند محض ایک ویب سائٹ سمجھا گیا تھا۔ کسی کو یہ

گمان بھی نہیں تھا کہ اس ویب سائٹ نے نیا نیا ہنگامے کرنے کی منصوبہ سازی کی ہے۔ چند سالوں میں ہی اس نے ایسے خطرناک رازوں تک رسائی حاصل کر لی جن تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔ اس نے خفیہ طور پر اپنا کام جاری رکھا اور جب اس کے پاس اتنے راز یکجا ہو گئے کہ وہ عالمی سطح پر ہنگامہ کھڑا کر سکے تو اس نے پوری پلاننگ کے ساتھ خود کو دنیا کے سامنے پیش کر دیا۔ اس کا نام عالمی سطح پر اس وقت منظر عام پر آیا جب جولائی 2010 میں اس نے افغانستان جنگ سے متعلق 91 ہزار امریکی راز ویب سائٹ پر پیش کر دیے۔ یہ وہ خط و کتابت یا مواصلات تھیں جو افغان جنگ سے متعلق تھیں اور جن کا حکومت امریکہ اور اس کے سفارت کاروں کے مابین تبادلہ ہوا تھا۔ اس میں ان تمام لوگوں کے نام بھی ظاہر کر دیے گئے تھے جن سے وہ معلومات موصول ہوئی تھیں۔ اس کے بعد اس نے ایک چار لاکھ دستاویزات عام کر دیں جو عراق جنگ سے متعلق تھیں۔ اس موقع پر اس نے ان لوگوں کے نام منظر عام پر کر دیے جو ان اطلاعات کا ذریعہ بنے تھے۔ ان انکشافات کے بعد امریکی حکومت نے اس پر توجہ دی اور اس سلسلے میں قانون بنائے جانے لگے۔

لیکن اصل ہنگامہ تو اس وقت ہوا جب 2010 کے اواخر نومبر میں اس نے ڈھائی لاکھ خفیہ امریکی رپورٹیں عام کر دیں۔ ان میں اکثر رپورٹوں کا تعلق تین سال کے واقعات سے تھا۔ اس کے بعد وکی لیکس پر سنجیدگی سے توجہ دی جانے لگی اور اسے ایک عالمی مسئلہ سمجھا جانے لگا۔ عالمی طاقتیں اس سے پریشان ہو گئیں اور حکمرانوں کا بہت بڑا طبقہ تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ ان انکشافات نے کئی دوست رہنماؤں کے مابین نا اتفاقی اور بدگمانی کی خلیج پیدا کر دی۔ اس انکشاف کے بعد امریکہ نے پوری دنیا کو وارننگ دی تھی کہ ابھی مزید ایسے انکشافات ہو سکتے ہیں اور ان کے اثرات بھی پڑ سکتے ہیں لہٰذا اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ قابل ذکر ہے کہ جس روز اس نے ڈھائی لاکھ کیبل اپنی ویب سائٹ پر پوسٹ کی تھی اسی روز دو سو سے اوپر کیبلس اخباروں میں شائع ہو گئی تھیں۔ ان کیبل پیغامات کا تعلق ان مواصلات سے تھا جو امریکی سفارت کاروں اور حکومت امریکہ کے مابین ہوئی تھیں۔ اور جن میں ایسی باتیں بھی تھیں جو منظر عام پر لانے کے لائق نہیں تھیں۔ سفارت کاروں اور حکومتوں کے ذمہ داروں کے مابین ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو آف دی ریکارڈ ہوتی ہیں یا جو ذاتی نوعیت کی ہوتی ہیں اور جن کا حکومتوں کی

پالیسی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لیکن وہ ایسی باتیں ہوتی ہیں کہ اگر فاش ہو جائیں تو تعلقات خطرے میں پڑنے کا اندیشہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وکی لیکس نے ایسی مواصلات کو بھی دنیا کے سامنے رکھ دیا جس کی وجہ سے کئی حکمرانوں، سیاست دانوں اور سفارت کاروں کو ایک دوسرے سے منھ چھپانے کی نوبت پیش آ گئی۔

بہرحال اس وقت امریکہ نے ہندوستان کو بھی انتباہ دیا تھا کہ اس کے بارے میں بھی انکشاف ہو سکتا ہے اور اسے ہوشیار رہنے اور حالات کو سنبھالنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ لیکن وقت کا کوئی تعین نہیں کیا گیا تھا۔ بہرکیف ہندوستان کا نمبر بھی آ گیا اور وکی لیکس نے سال 2008 میں ہند امریکہ نیوکلیائی جوہری توانائی معاہدے کے وقت تحریک عدم اعتماد کے دوران بعض ارکان پارلیمنٹ کی مبینہ خرید و فروخت کے سلسلے میں انکشاف کر دیا۔ الزام تو اس وقت بھی لگے تھے کہ حکومت کو بچانے کے لیے پیسوں کا استعمال کیا گیا ہے اور بی جے پی کے ارکان پارلیمنٹ نے وہ نقد پیسے ایوان میں لہرا کر بتایا تھا کہ انہی پیسوں سے ارکان پارلیمنٹ کو خریدا گیا ہے یا خریدنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہرحال اس پر کافی ہنگامہ ہوا تھا اور حکومت نے بعد میں اس کی جانچ کے لیے ایک کمیٹی بنا دی تھی۔ اس وقت ووٹنگ ہوئی اور حکومت جیت گئی۔ لیکن وکی لیکس کے انکشاف نے ایک بار پھر اس جن کو بوتل سے باہر نکال دیا۔ اس معاملے پر پارلیمنٹ میں زبردست ہنگامہ ہوا اور حکومت اور اپوزیشن نے ایک دوسرے پر الزام اور جوابی الزام کے خوب تیر چلائے۔ جب پہلے روز وکی لیکس نے بتایا کہ ووٹ کے عوض نوٹ دیے گئے تھے تو بی جے پی اور دوسری اپوزیشن جماعتیں کافی جوش میں تھیں اور انھوں نے وزیر اعظم سے استعفے کا مطالبہ کر دیا تھا۔ لیکن اگلے روز بی جے پی کے بارے میں بھی انکشاف ہو گیا۔ ویب سائٹ کے مطابق بی جے پی امریکہ کی مخالفت محض ریاکاری میں کرتی ہے۔ ایک امریکی سفارت کار سے بات چیت میں بی جے پی کے ایک سینئر لیڈر شیشادری چاری نے کہا تھا کہ ہم بھی ہند امریکہ معاہدے کے مخالف نہیں ہیں۔ ہم تو اس معاملے پر حکومت کی مخالفت اس لیے کر رہے ہیں تاکہ ہمیں حکمراں یو پی اے پر سیاسی سبقت حاصل ہو سکے۔ جب یہ انکشاف ہوا تو پھر ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔

حکومت اور وزیر اعظم نے ارکان پارلیمنٹ کو خریدنے کے انکشاف کو غلط قرار دیا اور کہا

کہ ووٹ کے عوض نوٹ دینے کا الزام بے بنیاد ہے۔ لیکن وکی لیکس کے بانی اسانج نے ایک ٹی وی انٹرویو میں اپنے انکشاف کو سچ بتانے کی کوشش کی اور کہا کہ اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو بے بنیاد ہو۔ دراصل سیاست میں اب اتنی گراوٹ آگئی ہے اور پیسے کا اتنا عمل دخل ہو گیا ہے کہ اب یہ کہا جائے کہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ سیاست کی گاڑی اب اصولوں کی پٹری پر نہیں کرنسی کی پٹری پر دوڑتی ہے اور یہ پٹری جدھر کو مڑتی ہے سیاست کی گاڑی ادھر کو ہی چلی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ کرنسی کی پٹری کو چھوڑ کر کوئی اور راستہ اختیار کرے۔ اس لیے اب ان باتوں پر افسوس کرنے سے کوئی فائدہ بھی نہیں ہے۔ جہاں تک وکی لیکس کے انکشافات کا تعلق ہے تو اس ویب سائٹ نے بہت سے سوالات کھڑے کر دیے ہیں اور یہ پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا صحافت کے نام پر ایسی باتوں کو بھی سب کے سامنے لایا جانا چاہیے جن سے ملک میں خلفشار پیدا ہونے کا اندیشہ ہو یا محض اس لیے کہ کوئی نئی بات سامنے آجائے ان باتوں کو عام کیا جانا چاہیے جن کا پردے میں رہنا ہی سب کے لیے مفید ہو۔ دنیا بھر میں ایسے قوانین موجود ہیں جن کی مدد سے غیر اخلاقی باتوں کو روکا جا سکے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی کے تعلق سے بھی قوانین موجود ہیں لیکن اب ان کی دھار کند ہوتی جا رہی ہے۔ امریکہ میں ایک قانون Espionage Act ہے جسے ختم کیا گیا تھا تاکہ ایسے مشوروں سے نمٹا جا سکے۔ لیکن اس ایکٹ کا دائرہ محدود رکھا گیا کہ اس پر کوئی بات واضح نہیں ہے یا وہ اپنے دائرہ کار میں رہ کر ایسے معاملات پر روک لگانے میں کامیاب نہیں ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اگر امریکہ سے باہر ایسا کوئی معاملہ سامنے آتا ہے تو کیا اس جگہ بھی اس کا نفاذ ہوگا اور کیا غیر امریکیوں پر بھی وہ لاگو ہوگا۔ دسمبر 2010 میں اس میں ترمیم کی گئی ہے۔ ہندوستان میں بھی ایک قانون موجود ہے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی ترمیمی ایکٹ میں اس کا انتظام ہے کہ میڈیا کس قسم کی چیزیں پیش کرے گا۔ اگر قابل اعتراض باتیں ہوں تو ان کے خلاف کارروائی ہو سکتی ہے۔ لیکن وکی لیکس جیسے معاملات سے کیسے نمٹا جائے گا اس بارے میں کوئی عالمی قانون شاید نہیں ہے۔ دنیا کی حکومتیں اس بارے میں اخلاقیات کی بات کرتی ہیں اور کہتی ہیں کہ میڈیا کو اخلاقیات کا پابند رہنا چاہیے۔ بہرحال یہ معاملہ کافی الجھ گیا ہے اور وکی لیکس نے عالمی سطح پر جو سوالات کھڑے کیے ہیں ابھی ان کے جواب سامنے نہیں آپا رہے ہیں۔

حالیہ انقلابات......فیس بک اور ٹوئیٹر

فراعنہ مصر کے جانشین حسنی مبارک کا تخت زرنگار عوامی انقلاب کے تند و تیز طوفان میں خس و خاشاک کی مانند بہہ گیا۔ اس سے قبل وہ تیس سال سے مصری حکومت پر قابض رہے ہیں لیکن وقت نے ان سے ایسا انتقام لیا جسے وہ اب اپنی باقی ماندہ زندگی میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکیں گے۔ یہ ایسا انقلاب تھا جسے امریکی صدر باراک اوباما نے گاندھیائی انقلاب کہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس انقلاب کی تاریخ خاک و خون سے نہیں لکھی گئی جیسا کہ عموماً ہوتا ہے۔ دنیا میں آنے والے بیشتر انقلابوں کی تاریخ انسانی لہو سے رقم کی جاتی رہی ہے۔ یہ انقلاب ان چند انقلابوں میں شامل ہے جن میں کوئی خون خرابہ نہیں ہوا اور کشتوں کے پشتے نہیں لگے۔ یہ اپنے آپ میں انوکھا انقلاب تھا۔ اسے گاندھیائی انقلاب کہنے کی یہ وجہ رہی کہ عدم تشدد کے اصول پر چل کر اسے منطقی انجام تک پہنچا دیا گیا۔ اس انقلاب کے ہیرو وہ دبے کچلے اور مظلوم عوام ہیں جو تیس برسوں سے ظلم و زیادتی کی چکی میں پسے جا رہے تھے اور جنھوں نے کبھی اف تک نہیں کی۔ دراصل تیونس میں آئے "انقلاب یاسمین" نے مصری عوام کو گہری نیند سے بیدار کر دیا اور وہ بھی سڑکوں پر نکل آئے۔ لیکن تیونس اور مصر کے انقلاب کے پس پردہ کچھ ایسے نادیدہ ہاتھ رہے ہیں جن پر لوگوں کی نظریں کم گئی ہیں۔ اگر ہم دیکھیں تو اس انقلاب کے اصل ہیرو ٹوئیٹر اور فیس بک ہیں۔ یہ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹ ہیں جن سائٹوں نے دراصل عوام کو ایک ڈور میں باندھ دیا تھا۔ آمریت کے خلاف اٹھے اس انقلاب کی عمارت میں یہ دونوں سائٹیں بنیاد کے پتھر کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انہی بنیادوں پر انقلاب کی تعمیر کی گئی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ موجودہ عہد انفارمیشن ٹیکنالوجی کا عہد ہے اور انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے پوری دنیا کے عوام کو ایک سائبان کے نیچے لا پہنچا دیا ہے۔ جہاں وہ ایک

دوسرے سے ٹویٹر اور فیس بک سے رابطہ کرتے ہیں اور آج کے عہد میں یہ رشتہ اتنا مضبوط ہو گیا ہے کہ اس نے ہماری زندگی کی شکل وصورت ہی تبدیل کر کے رکھ دی ہے۔

قارئین سوچ رہے ہوں گے کہ ٹویٹر اور فیس بک کیسے اس انقلاب کے ہیرو بن گئے۔ دراصل تیونس میں بھی یہی ہوا تھا۔ وہاں بھی انہی دونوں سائٹوں نے عوام کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ تیونس میں ایک تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوان معاش کے لیے پریشان تھا۔ اس نے جب دیکھا کہ تمام راستے بند ہو گئے ہیں تو اس نے ایک ٹھیلا خریدا اور اس پر سبزی بیچنے لگا۔ لیکن کرپشن اور بدعنوانی نے اس سے اس کا یہ روزگار بھی چھین لیا۔ ایک کرپٹ پولیس افسر نے رشوت نہ دینے کی پاداش میں اس کا ٹھیلا الٹ دیا اور وہ نوجوان جس کا نام محمد بوعزیزی تھا پھر بے روزگار ہو گیا۔ وہ اس واقعہ کے بعد انتہائی مایوس ہو گیا۔ لہٰذا اس نے خودسوزی کر کے اپنی زندگی ہی ختم کر دی۔ اس واقعہ کو فلما لیا گیا تھا اور پھر اسے فیس بک پر ڈال دیا گیا۔ فیس بک پر اس منظر کو دیکھنے کے بعد عوام میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور وہ سڑکوں پر نکل آئے۔ اس طرح وہاں کے صدر زین العابدین کو جو کہ 23 سال سے برسر اقتدار تھے حکومت چھوڑ کر بھاگ جانا پڑا۔ مصر میں بھی تقریباً یہی ہوا۔ وہاں چار نوجوانوں نے جو غریبی، بھکمری، بے روزگاری، بدعنوانی اور مہنگائی سے تنگ آ گئے تھے، خودسوزی کر لی۔ اس منظر کی بھی فلم بندی کر لی گئی اور اسے بھی فیس بک پر ڈال دیا گیا۔ ایک دوشیزہ نے جس کا نام اسماء محفوظ ہے اسے فیس بک پر ڈال کر اپنا ایک پیغام بھی ریکارڈ کر کے ڈال دیا۔ جس میں اس نے کہا تھا کہ میں نے یہ ویڈیو آپ کے لیے اس لیے بنائی ہے کہ میں آپ کو ایک عام سا پیغام دے سکوں۔ ہم اس حکومت کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے 25 جنوری کو تحریر اسکوائر پر جا رہے ہیں۔ ہم وہاں اپنے حقوق کا مطالبہ حکومت سے کریں گے۔ ہم اپنے بنیادی حقوق حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ ہم حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ وہ ہمیں آبرومندانہ زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرے جو کہ ہمارا حق ہے۔ یہ پوری حکومت بدعنوان ہے، کرپٹ ہے۔ سیکورٹی فورسز بھی کرپٹ ہیں۔ اگر آپ اپنے آپ کو ایک آدمی ایک انسان سمجھتے ہیں اور آپ بھی آبرومندانہ اور باعزت زندگی جینے کی خواہش رکھتے ہیں اور اس بدعنوان حکومت سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو آپ بھی تحریر چوک پر آئیے، ہم سے ہاتھ ملائیے، قدم سے قدم ملائیے اور اس حکومت کے خلاف پرزور مظاہرہ کیجیے۔

اس ویڈیو کو دیکھنے کے بعد مصری عوام کے اندر ایک آتش فشاں پھٹ پڑا اور اس سے جو شعلے اٹھے انھوں نے حسنی مبارک کی حکومت کو جلا کر خاکستر کر دیا۔

حالانکہ مصر میں انٹرنیٹ کا استعمال زیادہ نہیں ہے۔ 16 جنوری سے 24 جنوری 2010 تک ایک لاکھ [illegible] ویب سائٹ ہی اپ لوڈ کیے گئے تھے۔ لیکن 25 جنوری سے جو کہ مصری انقلاب کا روز اول تھا، ویب سائٹس کی تعداد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا اور 35 ملین سے زیادہ لوگوں نے ویب سائٹس اپ لوڈ کیے۔ یہ وہ تعداد ہے جس نے مصر میں حکومت کی تبدیلی کا بگل بجا دیا۔ مشرق وسطی کے حکمرانوں کو بھی اس انٹرنیٹ کی اہمیت کا احساس ہو گیا ہے۔ انھوں نے محسوس کر لیا ہے کہ فیس بک اور ویب سائٹ بہت ہی موثر اور طاقتور ذرائع ہیں۔ حسنی مبارک نے بھی یہی سمجھا اور اسی لیے انھوں نے ان دونوں ذرائع پر پابندی لگا دی اور پھر بعد میں انٹرنیٹ کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ انھوں نے 28 جنوری کی نصف شب کے بعد انٹرنیٹ کو پوری طرح ختم کر دیا تھا اور عوام کی [illegible] کے ساتھ رابطے [illegible] کوششوں میں ناکام رہے۔ [illegible] انٹرنیٹ پر [illegible] مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے [illegible] ہیں۔

اس انقلاب نے مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ میں ایک زلزلہ برپا کر دیا ہے اور متعدد ملکوں میں حکمرانوں کے خلاف بغاوت کا بگل بج گیا ہے۔ ان حکمرانوں کو بھی اس کا احساس ہو گیا ہے وہ اپنی حکومتوں کو بچائے رکھنے کے لیے متعدد عوامی اعلانات کر رہے ہیں۔ لیکن عوام ہیں کہ کسی بھی

اعلان کے جھانسے میں آنے والے نہیں ہیں۔ مصر کے تکنیکی ماہرین کو یہ اندیشہ ہے کہ ان ملکوں میں بھی انفارمیشن ٹیکنالوجی کو پابند احکام کرنے کی کوشش کی جا سکتی ہے۔ ان ملکوں میں بھی، جہاں عوام حکومتوں کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے ہیں یا نکلنے کے لیے پر تول رہے ہیں، انٹرنیٹ کو جام کیا جا سکتا ہے اور اس ڈور کو ہی کاٹنے کی کوشش کی جا سکتی ہے جو عوام کو ایک لڑی میں پرو رہی ہے۔ موجودہ عہد انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کا عہد ہے اور کامیابی اسی کے قدم چومے گی جو اس ٹیکنالوجی کا دوست بنے گا دشمن نہیں۔ عوام نے بھی اسے اپنا دوست بنا لیا ہے۔ وہ انٹرنیٹ کے ذریعہ اپنے جذبات و احساسات ایک دوسرے تک پہنچا رہے ہیں۔ اب اس محاذ پر بھی کام کیا جا رہا ہے کہ اگر حکومتیں انٹرنیٹ کو پابند زنجیر کرنے کی کوشش کریں تو اس کو کیسے ناکام بنایا جائے۔ حال ہی میں مصر سے یہ خبر آئی ہے کہ وہاں کے تکنیکی ماہرین ایسی کوششوں میں مصروف ہیں کہ انٹرنیٹ کو جام کرنے کی سازش کو ناکام بنایا جا سکے۔ ان کا خیال ہے کہ مختلف ملکوں میں جو چھوٹے چھوٹے پلس ہیں ان سے رابطہ رکھا جائے اور ایک ایسا نظام کیا جائے کہ انٹرنیٹ اور [illegible] دونوں [illegible] سکے اور کوئی اسے [illegible] کرنے کی کوشش کامیاب نہ ہو سکے۔

لیبیا میں بھی عوامی رابطوں کی [illegible] کا سہارا لیا گیا۔ قذافی مخالف طاقتوں نے انٹرنیٹ اور موبائل کے ذریعہ لوگوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کی کوشش کی۔ قذافی کے بیٹے سیف الاسلام نے عوام سے بات کرتے ہوئے [illegible] چار [illegible] کا ایک فارمولہ رکھا تھا اور کہا تھا کہ جو لوگ ان چار خطوط میں یقین رکھتے ہیں وہ متحد ہیں۔ یہ چار خطوط تھے اسلام، ملک، قانون [illegible] اور قذافی۔ مخالفین نے بھی [illegible] کا سہارا لیا اور انٹرنیٹ اور موبائل پیغامات کے ذریعہ لوگوں سے کہا کہ اگر آپ ان چار [illegible] میں یقین ہے تو آپ فلاں چوک پر آئیے اور حکومت مخالف مظاہروں میں حصہ لیجیے۔ گویا انھوں نے اس فارمولے کو ہی استعمال کیا لیکن قذافی کی حمایت میں نہیں بلکہ ان کی مخالفت میں۔ سوشل نیٹ ورکنگ سائٹس کا استعمال لیبیا میں بھی ہوا اور دوسرے ان ملکوں میں بھی جہاں عوام اپنی حکومتوں کے خلاف سڑکوں پر نکل آئے ہیں۔ وہاں بھی انہی سائٹوں سے لوگوں کو جوڑا جا رہا ہے۔

ای میل انٹرویو

انٹرنیٹ کے استعمال میں تیزی سے اضافے نے میڈیا میں کئی ابعاد جوڑ دیے ہیں۔ انٹرویو کو صحافت اور میڈیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ذریعہ سیاست دانوں اور دیگر شخصیات سے ان کی سوچ جاننے میں آسانی ہوتی ہے۔ بہت سے لوگ انٹرویو میں میڈیا پر اظہار کر کے میڈیا سے رشتہ قائم رکھتے ہیں تو ان کے پیشے کے لیے بھی مفید ہوتا ہے اور ان کے اپنے لیے بھی۔ انٹرنیٹ کی آمد کے بعد سے اب ای میل انٹرویو کا سلسلہ بھی چل پڑا ہے۔ تاہم ابھی اس کو بہت زیادہ رواج حاصل نہیں ہوا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی بڑی اہمیت ہے۔ ای میل انٹرویو کے مثبت اور منفی دونوں پہلو ہیں۔

اس کا مثبت پہلو یہ ہے کہ انٹرویو کرنے والا مطلوب شخص تک جانے کی زحمت سے بچ جاتا ہے اور گھر بیٹھے کئی سوالات کے جواب حاصل کر سکتا ہے۔ انٹرویو دینے والے شخص کے لیے بھی آسانی ہوتی ہے کہ وہ اپنی سہولت کے اعتبار سے شب و روز کے کسی بھی لمحے میں سوالوں کے جواب دے کر انٹرویور کے پاس بھیج سکتا ہے۔ گویا دونوں ہی اپنی اپنی سہولت کے اعتبار سے اپنا کام کر سکتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جواب دینے والا شخص اپنی خواہش اور جواب کے تقاضے کے اعتبار سے جواب کو مختصر یا تفصیلی بنا سکتا ہے۔ وہ اپنی تصویر بھی بھیج سکتا ہے۔ ای میل انٹرویو کا منفی پہلو یہ ہے کہ انٹرویو کے سوالات ایک طرح سے محدود رہتے ہیں۔ براہ راست یا بالمشافہ یا ٹیلیفونک انٹرویو کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سوال کے جواب سے بھی سوالات نکلتے ہیں اور متعدد ضمنی سوالات بھی ابھر کر سامنے آتے ہیں جبکہ ای میل انٹرویو میں اتنی وسعت نہیں آپاتی۔ گویا بالمشافہ انٹرویو میں تنوع ہوتا ہے جبکہ ای میل انٹرویو میں محدودیت ہوتی ہے۔ اس کا

[illegible]

سے۔ ریڈیو میں خبر دینے والے کی آواز ہی خبر کی ضمانت ہے۔ جبکہ ٹی وی اور ریڈیو انٹرویو میں اس کی گنجائش کم ہوتی ہے۔ تاہم اردو کی خبر زیادہ تیز ہو تو کہا بھی جاسکتا ہے۔ خاص طور پر سیاست دانوں سے یہ بعید نہیں ہے۔ ریڈیو پر ریکارڈنگ کے بارے میں بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ میری آواز سے چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے۔ جبکہ ٹی وی کو عدالت میں ثبوت کے طور پر تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔

ٹیکسٹ میسج یا برقی پیغام یا ایس ایم ایس آج کل ترسیل کے نئے ذرائع کے طور پر ابھرے ہیں۔ خاص طور پر ٹی وی چینلوں نے ایس ایم ایس کو بڑے پیمانے پر اختیار کر لیا ہے اور وہ ناظرین سے کسی بھی موضوع پر ایس ایم ایس منگا کر چند منٹ کے اندر نتیجہ نکال کر فیصد دیتے ہیں۔ اسے ٹیکسٹ میسج یا برقی پیغام بھی کہتے ہیں۔ یہ تیز ہوتے ہیں اس کا دائرہ کافی محدود ہے۔ اس سے وہ ان میں دو چند تیس بھی وقت بچ سکتا ہے۔ لیکن آج کل ایس ایم ایس کی جو نئی زبان تشکیل پا رہی ہے اس نے ایک انداز اختیار کیا ہے کہ کم الفاظ میں زیادہ میسج دیا جاسکتا ہے۔ گویا ایس ایم ایس کی زبان کو شارٹ ہینڈ کی ایک تبدیل شدہ زبان بھی کہا جاسکتا ہے۔ بہت سی کمپنیاں اپنے گاہکوں سے چند روپے ماہانہ یا چند روپے کا ریچارج کرانے کے عوض ایس ایم ایس کو فری کر دیتی ہیں۔ جس کا فائدہ نوجوان نسل خوب اٹھا رہی ہے۔ لیکن میرے خیال میں ٹیلیویژن میں ایس ایم ایس کا جو استعمال ہو رہا ہے وہ اس میں زیادہ قباحت ہے۔

پس نوشت

سہیل انجم کی تصنیفات
اہل قلم کی نظر میں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

ہے اور انداز تحریر دامن دل کو کھینچتا ہے۔

(پروفیسر عبدالحق)

سہیل انجم کا سفر نامہ حج ''پھر سوئے حرم لے چل'' متعدد خوبیوں کا حامل ہے۔ اس میں عقیدت بھی ہے، جذبات بھی ہیں اور تحقیق اور تاریخی باتیں شواہد کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کتاب میں صحافی، ادیب، مؤرخ اور عقیدت کا بھرپور آمیزہ ہے۔ اس کتاب میں جس انداز میں عبادت کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ مصنف حج کے ارکان کے ساتھ ہی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی وادیوں میں کھو گیا ہے۔

(پروفیسر اختر الواسع)

میں نے سہیل انجم کی تحریریں پڑھی ہیں اور خاص طور پر ان کی ادبی تصنیف ... میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان کا اپنا اسلوب ہے ... ان کی تحریر میں بہت دلکشی ہے جو قارئین کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے۔ یہ خوبی اگر صحافت سے وابستہ لوگوں میں نہ ہو تو ان کو کون پڑھے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ سہیل انجم کی یہ صحافتی خوبی ہے کہ ان میں بہت سی چاشنی ہے۔ ... خوبی سے ... صحافی کم ... ہوتے ہیں۔ مجھے ان کا انداز تحریر پسند ہے ... ان کی صحافتی خوبی میں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

(پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی)

صحافی و ادیب سہیل انجم نے اپنے سفر نامہ حج ''پھر سوئے حرم لے چل'' میں اپنے ... کی ... پیش کی ہے۔ اس کتاب کے حاجی اور ادیب میں کہیں رسہ کشی ... ان کا حاجی آگے نکلا ہے اور نہ ہی ان کا صحافی۔ سہیل انجم کا انداز بیان بہت ... اور ... قاری کو پوری کتاب پڑھنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

(... سہیل انجم صدیقی)

معروف صحافی سہیل انجم کا سفر نامہ حج ''پھر سوئے حرم لے چل'' اس وقت میرے

سامنے ہے۔ بہ ظاہر ایک کتاب ہے لیکن اس کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ یہ کئی کتابوں کی ایک کتاب ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر [illegible] سے استفادہ کیا ہے [illegible] 33 کتابوں کے حوالے دیے ہیں۔ میں ان کو داد دوں گا کہ انھوں نے تحقیق کے دوران واقعات کو ایک صحافی کی طرح دیکھا اور ایک تحقیق کار کے قلم سے لکھا۔ پوری کتاب انتہائی دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے۔ انداز بیان اتنا دلچسپ ہے کہ قاری کو جکڑ لیتا ہے اور قاری کو بہت لطف آتا ہے۔ میں اس انتہائی خوبصورت کتاب کی اشاعت کے لیے جمیل اختر کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

(پروفیسر [illegible])

جمیل اختر نے اپنی تصنیف "میڈیا روپ اور بہروپ" میں جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے وہ ہمارے دور میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اس وقت پورے ماحول پر میڈیا کے اثرات غالب نظر آتے ہیں [illegible] اس کے منفی پہلو بھی [illegible] ہیں۔ [illegible] کی طرح [illegible] میڈیا [illegible] بھی [illegible] ہے۔ [illegible] جمیل اختر نے اس کتاب کے ذریعے [illegible] کوشش کی ہے۔

(حمید [illegible])

"میڈیا روپ اور بہروپ" کے مصنف میں جمیل اختر نے حقائق کی تہہ تک اترجانے کی غیر معمولی صلاحیت [illegible] کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اگر موجودہ حالات میں بالکل نہیں [illegible] حقائق کے خارزار میں اپنے تلووں کو لہو لہان کرتے رہتے ہیں۔ [illegible] وہ حقائق کی [illegible] تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں [illegible] محسوس ہوتا ہے [illegible] قوت برداشت [illegible] میں کمال کی غیر معمولی صلاحیت اور [illegible] جائے گا جو صداقت کی کتاب [illegible] قوت سے [illegible] بے مثال خوبی [illegible] جمیل اختر نے صحافت [illegible] میڈیا [illegible]

[illegible] بہت پرکشش اور دلکش ہے۔ میری دعا ہے کہ یہ کتاب دوسرے لوگوں کے لیے حج کا باعث بنے۔

([illegible] امریکہ [illegible])

میرے سامنے سہیل انجم کی کتاب "[illegible]" ہے۔ یہ قابل قدر اور [illegible] تصنیف ہے۔ [illegible] میں چھ مختلف اہم عنوانات کے تحت مضامین اور [illegible] درج ہیں جو [illegible] سے متعلق اہم معلومات پیش کرتی ہیں [illegible] کی حیثیت رکھتے ہیں [illegible] ہوتا ہے [illegible] اور [illegible] سے مشرف ہونے [illegible] کی تحریر [illegible] میں [illegible] ہے۔

([illegible])

[illegible] معروف صحافی سہیل انجم نے [illegible] آغاز [illegible] ہیں [illegible] معروف صحافی ہیں اور ان کا تعلق [illegible] میڈیا [illegible] سے [illegible] میں [illegible] سہیل انجم اردو کے [illegible] ہیں [illegible] نکالے ہیں۔ ان کی کتاب [illegible] میڈیا [illegible] جدید [illegible] معروضی پیشکش، معاصر میڈیا کی [illegible] تجزیاتی مطالعہ ہے جس کی پذیرائی اردو [illegible] حلقوں میں ضروری ہے۔

(پروفیسر شافع قدوائی)

سہیل انجم نے اپنی تصنیف "میڈیا روپ اور بہروپ" میں فرسودہ روایات سے ہٹ کر ان موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جن پر صحافت کے بڑے چودھری خاموشی سے بھی اپنی رائے ظاہر کرنے سے خوف کھاتے ہیں۔ [illegible] میڈیا کی اس دور میں سہیل انجم جیسے اردو صحافیوں سے نئی تحریک ملتی ہے۔ اگر ان جیسے دوسرے نوجوان اردو صحافی بھی اپنے آپ کو بدگوشت چڑھے سماج سے علاحدہ کر کے اور خود کو اسی سماج کا ایک ایک مجبور جز ان کی طرف توجہ دیں تو اردو صحافت مثبت تبدیلی کا میڈیم بن سکتی ہے۔

(مومن چرافی)

سہیل انجم ہماری موجودہ نسل کے ایک معتبر اور نہایت باشعور اردو کے علم صحافی ہیں۔ ان کی تصنیف "میڈیا اردو اور جدید رجحانات" میں اعلی صحافت کے معیارات پر بحث کی گئی ہے اور مختلف عصری مسائل پر متوازن صحافت کا ایک نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ جس گہرائی، توازن، باخبری اور دردمندی کے ساتھ قلم اٹھاتے ہیں اس کو دیکھ کر مولانا عبد الماجد دریابادی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے اور محمد مسلم کا نقش ذہن کے پردے پر ابھرنے لگتا ہے۔

(ڈاکٹر سید احمد بدری)

سہیل انجم نے اپنی تصنیف "میڈیا روپ اور بہروپ" میں روایتی صحافت اور جدید میڈیا دونوں کا جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے [illegible] ہونے کی کوشش کی ہے جو ہر دور اور ہر خطہ [illegible] محمد [illegible] قوت عمل بھی [illegible] دائرے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ میڈیا خود وضاحت کا [illegible] لیکن سہیل انجم [illegible] ہے۔

(رضوان احمد)

سہیل انجم کی کتاب "میڈیا روپ اور بہروپ" موجودہ صحافت کا سنجیدہ احتساب ہے جو ان کی برسوں کی محنت اور شخصی تجربے کا ثمرہ ہے۔ کتاب دریافتوں کی محنت اور موضوع کی دردمندی سے معمور ہے۔

(جی ڈی چندن)

صحافت ایثار و قربانی کا دوسرا نام ہے۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے شہید ہونے والا پہلا صحافی اردو ہی کا تھا۔ تاہم افسوس ناک بات یہ ہے کہ اردو کے جو بھی نامور صحافی گزرے ہیں ان کی حقیقی عزت افزائی کبھی نہیں ہوئی۔ سہیل انجم کی تصنیف "بازیافت" میں جو مضامین ہیں وہ صحافت اور اردو والوں کے آئینہ دار ہیں۔ میں موصوف کی صحافتی لیاقت سے متاثر ہوا ہوں۔

(احمد ابراہیم علوی)

سہیل انجم کی تصنیف "میڈیا روپ اور بہروپ" کئی اعتبار سے بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایسے حقائق کا احاطہ کرتی ہے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہتے ہیں۔ ایک جانب جہاں انھوں نے اخبارات و رسائل کو موضوع بنایا ہے وہیں دوسری جانب الیکٹرانک میڈیا کا بھی بھرپور احاطہ کیا ہے اور موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔ صحافت کے طلبہ کے لیے تو یہ کتاب اہم اور مفید ہے ہی، صحافت سے دلچسپی رکھنے والے دیگر افراد کے لیے بھی قابل مطالعہ ہے۔ ان کی دوسری کتاب "مغربی میڈیا اور اسلام" بہت ہی حساس، سنگین، جلتے اور سلگتے ہوئے مضامین پر مبنی ہے۔ انھوں نے تمام موضوعات کا تجزیہ دلائل سے بھرپور کیا ہے اور اعداد و شمار سے اپنے استدلال کو مضبوط بنایا ہے۔ مغربی میڈیا ایک عفریت کی طرح ہمارے سامنے موجود ہے اس کا مقابلہ ہم کس طرح کر سکتے ہیں یہ سوال انھوں نے بڑی شدت اور جرأت سے اٹھایا ہے۔ سہیل انجم نے بڑی محنت سے اس موضوع پر یہ کتاب لکھی ہے اور شاید اس موضوع پر اردو میں لکھی جانے والی یہ پہلی کتاب ہے۔ ان کا انداز تحریر دلکش ہے اس لیے کتاب کے مطالعہ میں اکتاہٹ نہیں ہوتی۔

(ڈاکٹر رضوان احمد)

سہیل انجم نے اپنی کتاب میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے تقریباً تمام پہلوؤں کا سنجیدگی اور غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لیا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ میڈیا سے متعلق موضوعات و مسائل پر ان کی بڑی گہری نظر ہے۔ انھوں نے بہت سی باتوں کے حوالے دیے اور [illegible] بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میڈیا کے [illegible] تعلق [illegible] ہوتی ہے کہ ان میں سے بہت سے ایسے ہیں جو میڈیا کی موجودہ صورت حال سے ناواقف

رہتے ہیں جب یہ جاسوسی قوتیں ذہنوں کو کنٹرول کرتی ہوتی ہیں۔ وہ ایک اچھے صحافی ہیں اور صحافت کے تمام نکات سے واقف ہیں۔ ان کی اس کاوش پر ان کو داد ملنی چاہیے۔

(معین اعجاز)

نسیم انجم اردو صحافت میں ایک معتبر نام ہے۔ میڈیا کا موضوع ان کا اختصاص ہے۔ میڈیا پر اب تک ان کی تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور اہل علم حلقے سے داد و تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ وہ کسی بھی موضوع کو معروضی انداز میں دیکھنے کے قائل ہیں اور مسائل و معاملات کا غیر جذباتی اور غیر جانبدارانہ انداز میں تجزیہ کرتے ہیں۔

(ڈاکٹر ابرار رحمانی)

نسیم انجم نے خود صحافت کے "[illegible]" سے گزرے ہیں۔ [illegible] سے وہ بخوبی واقف ہیں اور صحافت میں [illegible] ہیں اس لیے اس کتاب میں انھوں نے بڑے خوبصورت انداز میں صحافیوں کو پیش آنے والے واقعات اور ان مراحل کا ذکر کیا ہے جن سے وہ گزرے ہیں۔ جگہ جگہ جذبات اور عقیدت و محبت کی گہرائی اور ان کو پیش کرنے کا انداز بیان ایسا دلچسپ اور پراثر ہے کہ قاری کو باندھے رکھتا ہے۔

(قمر سنبھلی)

نسیم انجم کا صحافت میں کافی معتبر نام ہے۔ انھوں نے [illegible] بہت [illegible] اپنے کیرئیر کا آغاز کیا۔ ان کے لیے صحافت پیشہ اور مشن دونوں ہے۔ وہ اس دور میں جبکہ صحافت [illegible] تجارت بن گئی ہے [illegible] صحافت کی [illegible] قدروں کو بچانے کا [illegible] صحافت کی [illegible] ہیں۔ "میڈیا کا بہروپ" میں انھوں نے میڈیا کے روشن [illegible] پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ [illegible] خود [illegible] ہیں اس لیے انھوں نے [illegible] صحافت کو قریب سے پرکھا ہے اور جس خارزار سے وہ گزرے ہیں اسے ہم صحافت میں ان کا [illegible] کہہ سکتے ہیں۔

(امین احمد نقوی)

"میڈیا کا بہروپ" کا مصنف ایک [illegible] غیر متعصب اور حقیقت پسند

صحافی ہے جس نے [illegible] ایک مستند ترجمہ یہ ذہن اور چشم جہاں بیں سے کتاب لکھی ہے اور [illegible] پیش کر دیا ہے جو عدل و انصاف کا تقاضا ہے۔ لکھنے والے نے [illegible] دوست دشمن دونوں [illegible] ہیں۔ بیدار ذہن زندہ ضمیر اور [illegible] آنکھوں سے [illegible] کرنے والے مصنف کا نام جمیل انجم ہے جو میڈیا کے [illegible]

(حقانی القاسمی)

[illegible]

([illegible])

[illegible]

انقلاب کے سبب ممکن ہو سکا ہے، کے مختلف ابعاد سے پیدا ہونے والے سوالوں کو ٹٹولنے کی کاوش کی ہے۔ بہ الفاظ دیگر میڈیا کا بہ حیثیت مظہر (Phenomenon) مطالعہ کرنا اور اس عمل میں اردو کی اخباری صحافت کی سرحد کو پار کر کے اردو انگریزی اور ہندی الیکٹرانک میڈیا پر بھی غور و خوض کرنا انجم کی تحریروں کا امتیازی وصف ہے۔

(ارشد امان اللہ)

☆ سہیل انجم کا امتیاز یہ ہے کہ وہ عرصے سے اردو صحافت سے وابستہ ہیں اور اس موضوع پر مسلسل لکھتے رہے ہیں۔ اپنی تازہ کتاب "میڈیا اردو اور جدید رجحانات" میں انھوں نے میڈیا اور صحافت اور ان کے حوالے سے پیدا ہونے والے جدید رجحانات و مظاہر کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

(وارث مظہری)

☆ سہیل انجم نے اپنی کتاب "میڈیا روپ اور بہروپ" میں اردو منظر نامہ کے ذیل میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو، اردو پریس اور جذباتیت اور اردو صحافت کے مسائل پر اس طرح گفتگو کی ہے کہ صحافت کے وہ گوشے بھی واضح ہو گئے ہیں جو شاید ابھی تک پوشیدہ تھے۔

(ڈاکٹر منور حسن کمال)

☆ سہیل انجم کی کتاب "بازیافت" کے مضامین انتہائی متنوع ہیں اور ان کی صلاحیتوں کا برملا اظہار ہیں۔ اس لیے یہ "بازیافت" مصنف کے لیے نہیں بلکہ قارئین کے لیے مصنف کی نوبہ نوع صلاحیتوں کی بازیافت ہے۔

(ایس اے رحمان)

☆ سہیل انجم بنیادی طور پر ایک صحافی ہیں لیکن سیاست کے علاوہ سماجی، تہذیبی، ادبی اور معاشرتی مسائل سے ان کی دلچسپی ان کے ذہین اور حساس ہونے کا ثبوت فراہم کرتی ہے۔ بازیافت کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف یہ کہ مسائل پر گہری نظر رکھتے ہیں بلکہ ان کے موثر اظہار پر بھی قادر ہیں۔

(سلیم انصاری)

☆ گزشتہ ایک ڈیڑھ دہائی میں میڈیا نے ترقی کا وہ سفر طے کیا ہے کہ عقل انسانی حیران رہ

جاتی ہے۔ ٹیلی ویژن اور انٹرنیٹ نے تو امکانات کی ایک لامحدود دنیا کے دروازے ہمارے لیے کھول دیے ہیں۔ اس روشنی میں میڈیا کا رول اور بھی زیادہ اہم اور غیر معمولی بن جاتا ہے کہ ہم ایک پل کے لیے بھی اس سے الگ نہیں رہ سکتے۔ اگر رہ بھی گئے تو یہ ہمارے لیے خسارے کا سودا ثابت ہوگا۔ اس اعتبار سے میڈیا کے طلبہ اور میڈیا سے وابستہ لوگوں کے لیے سہیل انجم کی تصنیف ''میڈیا اردو اور جدید رجحانات'' بے حد معلوماتی ہے اور علم کے نئے دروازے وا کرتی ہے۔

(ماجد جہانگیر)

مصنف کی دیگر کتابیں

1۔ میڈیا روپ اور بہروپ
2۔ میڈیا اردو اور جدید رجحانات
3۔ مغربی میڈیا اور اسلام
4۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط: حیات وخدمات
5۔ پھر سوئے حرم لے چل (سفرنامہ حج)
6۔ لبراہن رپورٹ اور بابری مسجد
7۔ بازیافت (تنقیدی مضامین کا مجموعہ)
8۔ فرقہ وارانہ جنون (ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا تحقیقی جائزہ)
9۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط (یادگاری مجلہ)
10۔ فاروق انصار کے افسانے
11۔ ڈاکٹر حنیف ترین: فن اور شخصیت

زیر طبع وزیر ترتیب:

1۔ انجم تاباں (مولانا حامد الانصاری انجم کے فن اور شخصیت کا تحقیقی مطالعہ)
2۔ رفتارِ صحافت
3۔ ہندوستان میں دینی مدارس کی صحافتی خدمات
4۔ آئینۂ ادب (ادبی مضامین کا مجموعہ)



سہیل انجم نئی نسل کے صحافیوں میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ ان کے خبر ونظر میں موجود واقعہ کی منصفانہ تعبیر ہمیں متاثر کرتی ہے۔ وہ ایک مدت سے اخباروں کے درونِ خانہ اسرار سے واقف ہیں۔ اردو صحافت کے ماضی وحال پر ان کی بصیرت افروز نظر ہے۔ صحافیوں کو کبھی کبھی بعض مجبوریوں کی وجہ سے دامنِ قلب ونظر کو آلودہ کرنا پڑتا ہے۔ یہ نہ مشیت کا منشا ہوتا ہے اور نہ صحافی کا صدق ویقین۔ حرص وہوس سے نیم آشنائی غیروں کے ضمیر کی ترجمان بن جاتی ہے۔ شکر ہے کہ سہیل انجم اس جادہ کے مسافر نہیں۔ وہ تحریر وقلم کی حرمت کا حتی المقدور پاس رکھتے ہیں۔ وہ اس لیے بھی مجھے عزیز ہیں کہ ان کی تحریریں شگفتگی سے خالی نہیں ہوتیں۔ ادب وانشا سے ہم آمیزی صحافت کے جوہر آشکار کرتی ہے اور دلنوازی بھی بخشتی ہے۔ یہ خوبیاں اخباروں کے کالموں سے مفقود ہو رہی ہیں۔ کچھ گنتی کے احباب ضرور ناموسِ صحافت کی پاسبانی اور ادب وانشا کی پرورش میں گامزن ہیں۔ سہیل انجم بھی ان میں شامل ہیں۔ ان سے بہت توقعات ہیں۔ دعا ہے کہ بہتر سے بہتر صورت گری ان کے صریر خامہ کو مہمیز کرتی رہے اور اردو صحافت کی درخشانی سے ان کی پیشانی پر نور رہے۔

پروفیسر عبدالحق